باب اوّل

جدیدیت کیا ہے؟

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ [1]

ترجمہ: اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔[2]

''یعنی ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی مدد پر ہمارا اعتماد ہے، اسی بناء پر ہم یہ درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں''[3]

قرآن حکیم میں ایک اور جگہ فرمان الٰہی یوں ہے:۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ [4]

ترجمہ: اسی کو پکارنا برحق ہے۔[5]

''پکارنے سے مُراد، اپنی حاجتوں میں مدد کے لئے پکارنا ہے، مطلب یہ ہے کہ حاجت روائی و مشکل کشائی کے سارے اختیارات اُسی کے ہاتھ میں ہیں''۔[6]

اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب سے نوازا ہے، جس کے ذریعے ہم ہر مسئلے کا حل تلاش کر سکتے ہیں، اُس کا فرمان ہے کہ تم ہر مدد کے لئے مجھ سے رجوع کرو یعنی مجھ سے ہی مدد مانگو اور یہ بھی کہا ہے کہ مجھ کو پکارنا ہی صحیح ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

۱: قرآن حکیم، سورہ ۱، آیت ۴

۲۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۲۴۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ قرآن حکیم، سورۃ ۱۳، آیت نمبر ۱۴۔

۵۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۴۰۳۔

۶۔ ایضاً۔

سے ہم کیسے مدد مانگیں؟ اُس کے لئے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا[1]

ترجمہ: لوگو، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آ گئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے، جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔[2]

سوال یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کیسے مدد مانگیں؟ اس کے لئے اللہ نے صاف جواب دیا ہے کہ میں نے تمہارے لئے قرآن بھیجا ہے اور تم اس کی روشنی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرو۔ اس لئے ہمیں ہر کام کے لئے قرآن سے مدد لینی چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ جدیدیت کیا ہے؟ یوں تو جدیدیت ایک ادبی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ مگر کیوں نہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کیا قرآن میں اس کے بارے میں کوئی ذکر آیا ہے، اگر ہم ادبی اصطلاحوں کو پہلے قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کریں۔ اس سے ایک تو ہماری صحیح رہنمائی ہوگی، دوسرے ادب پر سے وہ گرد آلودہ غلاف ہٹ جائے گا، جس کی زد میں آ کر ہمارے فکر و عمل میں غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقم طراز ہیں:

> ''ادب اور مذہب کو الگ الگ خانوں میں رکھنا غیر عقلی بات ہے، مذہبی امتزاج کے بغیر ادب غیر ذمہ دار اور غیر اخلاقی ہو جاتا ہے۔ سارا جدید ادب لادینیت کی وجہ سے بگڑ گیا ہے۔''[3]

ہمارے کئی بزرگ ادباء نے ایسی کوششیں کی ہیں اور وہ ان میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اور زمانے نے انہیں مصلح کا خطاب بھی دے دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسا ذہن

۱: قرآن کریم، سورۃ ۴، آیت نمبر ۱۷۴۔

۲۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۱۸۰۔

۳۔ نئی تنقید، مرتب خاور جمیل، ص ۳۷۔

بن جائے جس سے ظہور میں آنے والے خیالات اور تخلیقات روشن ہوں جو زندگی کو شعور اور ایک طرح کا اعتبار بخشے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے جدیدیت (Modernity) کے بارے میں کوئی اشارہ دیا ہے۔ پہلے ہم یہی جاننے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں صاف الفاظ میں بیان فرماتا ہے:۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ[1]

ترجمہ: تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔[2]

یعنی تمہیں ایک ہی حالت پر نہیں رہنا ہے، بلکہ جوانی سے بڑھاپے، بڑھاپے سے موت، موت سے بَرْزخ، بَرزخ سے دوبارہ زندگی، دوبارہ زندگی سے میدان حشر پھر حساب و کتاب پھر جزا و سزا کی بے شمار منزلوں سے لازماً تم کو گزرنا ہوگا۔ اس بات پر تین چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ان تین چیزوں کی قسم مندرجہ بالا آیت سے پہلے کی تین آیتوں میں کھائی گئی ہے۔

۱۔ سورج ڈوبنے کے بعد شفق کی سُرخی۔

۲۔ دن کے بعد رات کی تاریکی اور اُس میں اُن بہت سے انسانوں اور حیوانات کا سمٹ آنا جو دن کے وقت زمین پر پھیلے رہتے ہیں، اور

۳۔ چاند کا ہلال سے درجہ بدرجہ بڑھ کر بدر کامل بننا۔

یہ چیزیں اس بات کی علانیہ شہادت دے رہی ہیں کہ جس کائنات میں انسان رہتا ہے، اس کے اندر کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، بلکہ ایک مسلسل تغیر اور درجہ بدرجہ تبدیلی ہر طرف پائی جاتی ہے۔

۱: قرآن حکیم، سورہ ۸۴، آیت ۱۹۔

۲۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۹۲۷۔

قرآن حکیم کے سورۃ الانشقاق کی آیت نمبر اُنیس (۱۹) سے پہلے کی تین آیتوں ۱۶، ۱۷، ۱۸، میں بالترتیب اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کی قسم کھا کر کائنات کے مسلسل تغیر یا تبدیلی کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، یہ تین چیزیں ہیں، شفق، رات اور چاند۔ شفق کی سُرخی، جو غروب آفتاب کے بعد شام کو نمودار ہوتی ہے، یعنی روشن دن کا اچانک رنگ بدلنا اور یہ رنگ آخر کار آہستہ آہستہ رات کی تاریکی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان کو ایک اشارہ دے جاتا ہے کہ تو اپنا رنگ بدل اور یہ بدلاؤ تمہارے لئے فطری بھی ہے اور ضروری بھی، تا کہ تجھ میں جمود نہ آجائے یا تو کہیں ایک ہی حال میں منجمند نہ ہو جائے۔

دن کے بعد شفق کا آنا، شفق کے بعد رات کا آنا، رات کے بعد ایک نئے دن کا آغاز پھر ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ کائنات اپنے رنگ بدلتی رہتی ہے اور اس کا اثر ایک انسان پر براہ راست پڑتا رہتا ہے۔ اس میں کام اور آرام دونوں شامل ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل بھی ہے اور اس میں تسلسل بھی ہے۔ اس کو ہم اسطرح سمجھ سکتے ہیں:

دن، شفق، رات اور پھر نیا دن

یہ ایک مسلسل عمل ہے، یعنی دن کے بعد رات اور رات کے بعد نئے دن کا آنا، ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ تم نے دن میں کیا حاصل کیا اور رات کے آرام کے بعد تم نئے دن میں کیا کرنے والے ہو، مگر نئے دن میں جو کچھ نیا کرنا ہے، اس میں گزرے ہوئے دن کا حاصل ساتھ رہے گا اور اسی حاصل کے ساتھ مل کر، نئے دن کا نیا کام بنے گا۔ اسی طرح یہ کائنات چلتی رہے گی اور پُرانے سے نیا بنتا رہے گا اور یہ ایک مسلسل عمل ہے، جس میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے، ایک مسلسل تغیر یا تبدیلی جو درجہ بدرجہ آتی ہے، اُسی کا نتیجہ ہے۔ اسی تبدیلی کو مزید سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتے ہیں:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ[1]

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں، اہل عقل کے لئے۔[2]

''چنانچہ قرآن نے تسکین حیات کے مختلف پہلوں پر جا بجا توجہ دلائی ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اُکتاتی ہے اور تبدیلی وتنوع میں خوش گواری و کیفیت محسوس کرتی ہے۔ پس اگر کائنات ہستی میں محض یکسانی و یک رنگی ہی ہوتی تو یہ دلچسپی پیدا نہ ہوسکتی جو اس کے ہر گوشے میں ہمیں نظر آرہی ہے۔ اوقات کا اختلاف، موسموں کا اختلاف، خشکی و تری کا اختلاف، مناظر طبیعت اور اشیاء خلقت کا اختلاف، جہاں بے شمار مصلحتیں اور فوائد رکھتا ہے، وہاں ایک بڑی مصلحت دنیا کی زیب وزینت اور معیشت کی تسکین وراحت بھی ہے''۔[3]

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں بتایا کہ یہ کائنات ایک مسلسل عمل کا نتیجہ ہے اور اس میں تبدیلی یا تغیر فطری بھی ہے، اور لازمی بھی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کو اور بہتر طریقے سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی طبعیت کا خاصہ ہے کہ یکسانی سے اُکتاتی ہے اور تبدیلی و تنوع میں خوشی حاصل کرتی ہے، یعنی تنوع اور تبدیلی انسانی فطرت ہے۔ اس میں اُس سے خوشی محسوس ہوتی ہے اور جو شخص تغیر پسند نہیں ہوتا اُس پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور اُس کو لوگ آج کی زبان میں پسماندہ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی صاف کہہ دیا:

۱: قرآن حکیم، سورۃ ۳، آیت ۱۹۰۔

۲۔ مترجم مولانا اشرف علی تھانویؒ، قرآن مجید عکسے، ص ۹۲۔

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد، تفسیر سورۃ فاتحہ، ترجمان القرآن، ص ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

''اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں دلائل ہیں، اہل عقل کے لئے''[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل عقل کے الفاظ استعمال کئے ہیں، یعنی جن لوگوں کے پاس عقل ہے، جو لوگ اہل دانش ہیں، ہوش مند ہیں، اُن کے لئے رات اور دن کے مسلسل آنے میں دلائل ہیں۔ اہل عقل ہی اُن دلائل کو تلاش کر سکتے ہیں، یہ عام لوگوں کا کام نہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ رات اور دن صرف کام اور آرام کے لئے ہیں بلکہ اس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں، جن کو ظاہر کرنا اہل عقل کا کام ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم ایک روشن دلیل ہے، جس کی روشنی سے انسان کو فائدہ اُٹھانا ہے اور اُس میں ایسا علم چھپا ہوا ہے، جس کے ذریعے ہم منجمد زندگی میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور اپنے آپ کو جدید سے جدید تر بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے فی الحال ہم اگر صرف رات اور دن کے مسلسل تبدیل ہونے پر غور و فکر کریں، تو یہ ہماری تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے فکر اور کوشش کی ضرورت ہے اور یہی فکر اور کوشش ہمارے لئے راستہ ہموار کر سکتی ہے، گویا ہمیں چوبیس گھنٹوں کے مسلسل تبدیل ہونے اور رنگ بدلتے رہنے پر غور و فکر اور عقلی دلائل سے کام لینا ہے کہ یہ چوبیس گھنٹے کس طرح ایک انسان کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ مولانا آزاد اس کے بارے میں، یوں کہتے ہیں:

> ''رات اور دن کا اختلاف، صرف رات اور دن کا ہی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ہر دن مختلف حالتوں سے گزرتا اور ہر رات مختلف منزلیں طے کرتی ہے اور ہر حالت ایک خاص طرح کی تاثیر رکھتی ہے اور ہر منزل کے لئے ایک خاص طرح کا منظر ہوتا ہے، صبح طلوع ہوتی ہے اور اس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے، دن ڈھلتا ہے اور اس کا ایک خاص منظر ہوتا ہے، اوقات کا یہ روزانہ اختلاف ہمارے احساسات کا ذائقہ بدلتا رہتا ہے اور یکسانیت کی افسردگی کی جگہ تبدل و تجدد کی لذت اور

۱: مترجم مولانا اشرف علی تھانویؒ، قرآن مجید عکسے، ص ۹۲۔

سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسی طرح انسان خود اپنے وجود کو دیکھے اور تمام حیوانات کو دیکھے، فطرت نے طرح طرح کے اختلافات سے اس میں تنوع اور دل پذیری پیدا کر دی ہے!''[1]

ماں کے پیٹ میں بچہ بننا، پھر پیدا ہو جانا، پھر بچپن سے جوانی میں داخل ہونا، جوانی سے بڑھاپا، اُس کے بعد مرنا، مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا، حساب و کتاب، جزا و سزا اور اُس کے بعد؟ اسی طرح دن طلوع ہونا، پھر دن کا مختلف اوقات کے بعد غروب ہو جانا، شفق کا عمل، رات کی تاریکی، رات کا گزرنا، طلوع آفتاب سے پہلے شفق کا عمل اور پھر نیا دن۔

بے شک ان تمام چیزوں میں ارباب دانش کے لئے حکمت الٰہی کی طرف سے بہت سی نشانیاں موجود ہیں جو ہمیں صاف صاف الفاظ میں یہ بتاتی ہیں کہ تبدیلی ایک قدرتی عمل ہے۔ شاید اسی وجہ سے کسی نے کیا خوب کہا ہے، ''Change is law of nature'' یعنی تبدیلی قدرت کا قانون ہے اور ہمیں اس قانون کے ساتھ چلنا ہے۔ تبھی ہم زندگی بہتر ڈھنگ سے جی سکتے ہیں ورنہ ہم بھی پسماندہ کہلائیں گے اور باقی ترقی کرتے کرتے آگے نکل جائینگے۔ قدرت نے ہمیں نہ جانے کتنے اشارے دے دئے ہیں کہ تم کو بدلنا ہوگا۔ یہ اب ہمارا کام ہے کہ ہم بدلیں یا اُسی حالت پر رہیں جس پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمایا ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا۟ مَا بِأَنفُسِهِمْ[2]

ترجمہ: واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔[3]

مندرجہ بالا آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا ہے کہ میں کیونکر تمہاری حالت

۱: تفسیر سورۃ فاتحہ، ترجمان القرآن، ص ۱۲۹، ۱۳۰۔

۲۔ قرآن حکیم، سورۃ ۱۳، آیت ۱۱۔

۳۔ مترجم مولانا اشرف علی تھانویؒ، قرآن مجید عکسے، ص ۳۰۲۔

بدلوں، جب کہ تم بے فکر ہو اور تمہیں اپنی حالت کو بدلنے کے بارے میں کوئی تشویش لاحق نہیں ہے۔ جب تمہیں بھی اپنی حالت کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں یا جب تم ہی اپنی تبدیلی نہیں چاہتے تو مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں کہ میں آسمان سے فرشتے بھیجوں یا کسی اور طریقے سے تمہیں تبدیل کروں، جب کہ تمہارے پاس روشن دلیل (سورۃ النسآء آیت ۱۷۴) موجود ہے اور جب کہ میں نے تم کو علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے (سورۃ العلق، آیت ۱۔۶)، (سورۃ الدھر، آیت ۱۔۲)، (سورۃ فاطرہ، آیت ۲۸)، (سورۃ النور، آیت ۲۴) وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ جہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں علم حاصل کرنے اور اُس پر تحقیق کرنے اور اندھی تقلید سے پرہیز کرنے پر زور دیا ہے، وہیں اُس نے علم کی ایک خاص کتاب کا ذکر بھی کیا ہے۔

عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ[1]

ترجمہ: کتاب کا ایک علم[2]

کتاب کا یہ خاص علم کوئی ایسا علم ہوسکتا ہے کہ جس کے ذریعے یعنی جس کی تحقیق کرنے کے بعد ہم کوئی اہم اور مفید کارنامہ انجام دے سکتے ہیں یا کوئی ایسی ایجاد یا دریافت کر سکتے ہیں جس سے آنے والی نسل مستفید ہوسکتی ہے مگر اس کے لئے زبردست محنت اور تحقیق کی ضرورت ہے محنت اور تلاش و تحقیق ایک ایسا عمل ہے جو نئی راہیں ڈھونڈنے میں مددگار اور معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے انسان کو اس کائنات کی حقیقت جاننے کی سب سے پہلے کوشش کرنی ہے اور اُسے یہ تحقیق کرنی ہے کہ اُسے اس کائنات میں کیوں بھیجا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک اس کائنات کی حقیقت ایک انسان کو معلوم نہ ہو جائے تب تک وہ یہ جان نہیں سکتا کہ خود اُس کی حقیقت کیا ہے؟ کائنات کے ساتھ اس کے تعلق اور کائنات کی حقیقت سے اُسے اپنی

۱: القرآن، سورۃ ۲۷، آیت ۴۰۔

۲۔ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی، تدبرِ قرآن، جلد پنجم، ص ۶۰۱۔

حقیقت کا سُراغ ملتا ہے کیونکہ وہ خود بھی کائنات کا ایک اہم جزو ہے اور اپنی حقیقت اُسے اس لئے جاننے کی ضرورت ہے، تا کہ اُسے معلوم ہو جائے کہ اس کو اپنی زندگی کا استعمال کس طرح کرنا چاہئے۔ اس کی زندگی کا اصلی مقصد کیا ہے؟ اور وہ اپنی عملی زندگی کی تشکیل اور تعمیر کس طرح سے کرے؟ تا کہ وہ اپنے لئے اس دنیا میں یا اگلی دُنیا میں بہترین قسم کے نتائج اور ثمرات حاصل کر سکے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب حاصل کر لے گا تو اسی جواب میں اُسے اپنے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب مل جائے گا اور پھر وہ اس جواب کی روشنی میں اپنے تمام مسائل کا صحیح حل معلوم کر سکے گا اور اپنی زندگی کا استعمال صحیح طریقے سے کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کا جو تصور بھی وہ قائم کرتا ہے وہ اپنی عملی زندگی کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کے مطابق بناتا ہے گویا اس کے لئے حقیقت کائنات کی تلاش نہ تو کوئی تفریحی مشغلہ ہے اور نہ ہی کوئی عملی یا نظری مسئلہ بلکہ ایک شدید عملی ضرورت ہے جسکی اچھی یا بُری تشفی اس کی روزمرہ زندگی کے تمام حالات اور اس کی تمام چھوٹی اور بڑی تفصیلات کو متعین کرتی ہے۔ حقیقت میں بہتر زندگی جینے کے لئے اُسے کائنات کے متعلق ہر قسم کے ممکن سوالات کا تسلی بخش جواب حاصل کرنا ہے۔ کائنات کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لئے اُسے علم کے سمندر میں چھلانگ لگانا لازمی ہے اور اُس کی تہہ میں جا کر اپنی پیاس بُجھانی ہے۔ اس کے لئے زبردست محنت اور تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے۔

اگر انسان کو اسی طرح زندگی بسر کرنی ہے، یعنی بنا کسی تغیر کے یا کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ نہیں کرنا تو اُس کی زندگی منجمد ہو کر رہے گی اور اُس کی زندگی حُسن سے محروم ہو جائے گی کیونکہ جب اس میں تنوع اور تغیر یا تبدیلی کے بجائے انجماد ہو گا، تب اس میں خوبصورتی کہاں رہے گی۔ تنوع اور تغیر کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت اور تحقیق، جو ہمیں نئے علوم تک پہنچائے گی جس سے ہمارا تاریک ماضی، حال کی زبردست محنت اور تحقیق کے بعد روشن مستقبل

میں تبدیل ہو جائے گا اور جدیدیت کا فلسفہ بھی یہی ہے جو قرآن کا ہے یعنی عقل سے کام لینا ہے اور مستقبل کو روشن سے روشن تر بنانا ہے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

يُقَلِّبُ ٱللَّهُ ٱلَّيْلَ وَٱلنَّهَارَ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي ٱلْأَبْصَٰرِ [1]

ترجمہ: رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے، اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کیلئے۔[2]

چنانچہ ہم پہلے ہی رات اور دن کے الٹ پھیر پر بات کر چکے ہیں اور آخر میں اسی نتیجہ پر پہنچے کہ رات اور دن کا تغیر ایک مثال ہے اہل عقل کے لئے کہ تبدیلی لازمی ہے۔ مگر مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نئے انداز میں سمجھاتا ہے کہ رات اور دن کا تغیر سبق ہے اُن لوگوں کے لئے جن کے پاس آنکھیں ہوں یعنی جو اس کو دیکھ سکیں جو رات اور دن کی تبدیلیوں کو دیکھ سکیں اور اس پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں۔ یہاں آنکھوں والوں سے بصارت والے مُراد نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ، جن کے پاس عقل ہو۔ یہاں پر آنکھوں کو عقل سے تشبیہ دے کر بتایا گیا ہے اے عقل والو! کیا تم سبق حاصل نہیں کرتے رات اور دن کے تغیر سے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی طرف اشارہ دیا ہے دوسری جگہ اللہ اس طرح فرماتا ہے۔

نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا [3]

ترجمہ:۔ ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔[4]

اب ہمیں قرآن کے ان الفاظ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس آیت کے پس منظر میں ایک ایسا پیغام چُھپا ہوا ہے جو ایک عقل مند انسان کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے مندرجہ

۱: القرآن، سورۃ ۲۴، آیت ۴۴۔

۲۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۵۶۲۔

۳۔ القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲۔

۴۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۹۱۰۔

بالا آیت مبارک کے ذریعے اللہ تعالیٰ یہ پیغام دیتا ہے کہ میں نے تمہیں آنکھیں اور کان دئے، کہنے کو تو یہ ایک عام بات ہے کہ میں نے تمہیں آنکھیں اور کان دئے کیونکہ حیوانات مثلاً گائے، بیل، بکری وغیرہ، کو بھی یہ نعمتیں عطا کی گئی ہیں جن کے ذریعے سے وہ دیکھ اور سُن سکتے ہیں، مگر اس آیت میں ایک فلسفہ موجود ہے جس پر غور وفکر کی ضرورت ہے حیوانات آنکھوں سے صرف دیکھ اور سُن سکتے ہیں اس کے بجائے ایک عقل منداور دانش مند انسان کے لئے یہ دیکھنے اور سننے کی وہ قوتیں نہیں جو ایک حیوان کو دی گئی ہیں، بلکہ انسان کو عطا کی گئی اللہ کی ان نعمتوں کا مثبت استعمال کرنا ہے کیونکہ آنکھوں اور کانوں کے ساتھ ایک ایسا دماغ بھی جڑا ہوا ہے جو ایک حیوان کے پاس نہیں ہے، جس طرح انسان کو آنکھوں اور کانوں کے ساتھ عقل سے بھی نوازا گیا ہے اُسی طرح اُس کو عقل کے ساتھ علم بھی عطا کیا گیا ہے (سورۃ العَلق ۱۔٦) مندرجہ بالا آیت کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ انسان کو وہ قوتیں اور ذرائع عطا کئے گئے ہیں جن کے ذریعے وہ علم حاصل کرتا ہے اور علم حاصل کرنے کے بعد اس پر غور وفکر اور تحقیق کر کے نتائج اخذ کرتا ہے اور یہاں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ سماعت اور بصارت انسان کے علم میں سب سے زیادہ اور اہم کردار ادا کرتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ انسان سے کہتا ہے کہ میں نے تمہیں سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ مگر کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہیں علم دیا گیا ہے اور عقل دی گئی ہے تا کہ تم اپنی عقل اور علم کی مدد سے اپنے مستقبل کو روشن کرو۔ محنت کرو، تحقیق کرو اور بہتر زندگی جینے کی کوشش کرو۔ قرآن نے اپنی تعلیمات و ہدایات میں اس حقیقت کی جگہ جگہ وضاحت کی ہے کہ جہاں ایمان بالغیب کی ضرورت ہے وہاں حقیقت شناسی کی راہ میں عقل وفکر کی قوت کو استعمال کرنا ہے۔

اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں:

> ”۔۔۔قرآن آسمانی کتابوں میں آخری کتاب ہونے کے تعلق سے قدیم اور جدید دونوں قسم کے علوم کا حاصل ہے، علوم قدیم کے لئے قرآن ایمان بالغیب کا حکم دیتا

ہے اور عُلومِ جدیدہ کے لئے نظام فطرت پر غور وفکر کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور غور وفکر کے ذریعے پوشیدہ علمی حقائق کے انکشاف کا راستہ بتاتا ہے ۔۔۔قرآن، احادیث اور اقوالِ صحابہ وتابعین میں جس تفکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے اس تفکر کے وسیع مفہوم میں دین اور دنیا دونوں شعبوں میں غور وفکر مراد ہے''۔[۱]

مندرجہ بالا دلیل سے اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کو غور وفکر کر کے حقیقت کا انکشاف کرنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہ ایک معتدل، روشن خیال اور ایک ایسی منفرد کتاب ہے، جس میں قدیم وجدید علوم کی آمیزش ہے۔اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین یا اس کائنات میں عقل مندوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں موجود ہیں مگر ان نشانیوں کو پانے کے لئے غور وفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ یہ کائنات بے مقصد اور بے فائدہ نہیں ہے، یعنی اس نظام کائنات کے ہر ذرہ میں دنیا والوں کے لئے چیزیں پوشیدہ ہیں اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے خبر دار کیا ہے کہ تمہارے لئے تغیر یا تبدیلی ضروری ہے کیونکہ اس تبدیلی کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا[۲]

ترجمہ: اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے، تو کہتے ہیں ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔[۳]

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف بتایا ہے کہ ہر قوم، ہر خاندان یا ہر شخص کا ٹھیک راستے پر ہونا یا حق پر ہونا ضروری نہیں۔ جو بات یا جو کام یا جو طریقہ نسل در نسل چلا آرہا ہے یا

۱: ماہنامہ ''سائنس''، نئی دہلی، جلد ۱۳، شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۸۔

۲۔ القرآن، سورۃ ۳۱، آیت ۲۱۔

۳۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۶۴۸۔

جس پر تمہارے آبا واجداد تھے، وہی طریقہ یا وہی کام تمہارے لئے ٹھیک ہے، لیکن اللہ کے نزدیک ٹھیک نہیں کیونکہ کوئی عقل مند شخص ایسی نادانی نہیں کرسکتا کہ اگر اس کے باپ دادا گمراہ رہے ہون تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے اُن کی تقلید کرے یا اُن کی ہی نقل کر کے اُن کی ہی راہ پر چلے اور کبھی بھی یہ غور وفکر یا تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے کہ یہ راہ کدھر جارہی ہے۔ اس کو ہم اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ باپ دادا کی اندھی تقلید غلط راستے کی طرف ایک قوم، خاندان یا فرد کو لے جاسکتی ہے۔ گویا اس کا بدلنا ضروری ہے، تاکہ اس کی ترقی ہو اور وہ گمراہ نہ ہو جائے یا کہیں اندھی تقلید کی وجہ سے وہ پسماندہ نہ رہے۔

سولہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے علوم کی اہمیت کو مدنظر رکھا، چنانچہ مسلمان آگے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے یہاں علم کی طرف سے بے توجہی اور تحقیق و تجربے کی طرف سے بے اعتنائی عام ہوگئی۔ مسلمان کئی طرح کی بُرائیوں میں مبتلا ہوئے اور جب مسلمانوں نے صداقت ،شجاعت، عدالت، فلسفہ، فکر، سائنس، تاریخ وغیرہ کا سبق چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے حکومت چھین لی، نتیجے میں انسانیت کے کارواں کی ترقی مغرب کے ہاتھوں میں آگئی۔ مغرب نے انسانیت کو جو کچھ دیا اُس کو نظر انداز کرنا یا اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ مغرب کی ترقی دراصل علوم کی ترقی اور سائنس کی ترقی سے عبارت ہے اور ہمیں اس ترقی کا اعتراف اور احترام کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہم نے علوم کی تحقیق چھوڑ دی اور مغرب نے اس کو اپنایا، نتیجہ یہ نکلا ہم پسماندہ ہوگئے اور مغرب آگے بڑھتا گیا۔ اب ہمیں اس بات پر افسوس نہیں کرنا چاہئے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے مسلمان بہت آگے تھے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کہاں ہیں!

موجودہ صدی سائنس اور تیکنالوجی کی صدی ہے۔ سائنس اور تیکنالوجی نے انسان کو جو اقتدار دیا ہے، فرد کی آزادی پر جو توجہ کی ہے، سماج کی اصلاح میں اس کا جو رول ہے، جمہوری

تصورات اور جمہوری اداروں کے فروغ میں جو اس کا کارنامہ ہے، معیار زندگی بڑھانے میں جو اس کی سعیٔ بلیغ ہے انسان کے علم اور اس کے وسائل میں جو اس کا اضافہ ہے اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اگر یہ مغرب نے کیا ہے تو ہمیں اس کو تسلیم کرنا ہوگا، مگر اس کو مغرب کی جاگیر بننے نہیں دینا ہے، بلکہ خود تحقیق کر کے نئے نئے راستے تلاش کرنے ہیں۔ جب وہ ازمنۂ وسطیٰ کی دین سے مستفید ہو سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے ہیں یا تو ہم میں صلاحیت نہیں یا ہم کاہل ہو گئے ہیں اور اگر معاملہ اسی طرح چلتا رہا تو ہم جدید نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف کہا ہے کہ ''جب تک تم خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کرو گے میں بھی تمہیں اُسی حال پر چھوڑ دوں گا جس حال میں تم ہو نگے''۔ قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کے ذریعے ہمیں بار بار ہدایت کی جاتی ہے کہ تم بدل جاؤ اور مثالوں کے ذریعے ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ جدید ہو جاؤ اور زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ [1]

ترجمہ:۔ ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔ [2]

''یعنی ہر وقت اس کارگاہ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے اور وہ بے حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی دنیا ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور اُس کا خالق ہر بار اُس سے ایک نئی صورت میں ترتیب دیتا ہے، جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے''۔ [3]

۱: قرآن حکیم، سورۃ ۵۵، آیت ۲۹۔

۲۔ مترجم سید ابوالاعلیٰ مودودی، تلخیص تفہیم القرآن، تلخیص (مولانا صدرالدین اصلاحی)، ص ۸۳۰۔

۳۔ ایضاً، ص ص ۸۳۰، ۸۳۱۔

قرآن حکیم کی اس آیت کو پس منظر میں رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی یہ کائنات ایک حال پر نہیں رہتی بلکہ ہر لمحہ، ہر وقت، ہر پل اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور یہ بدلنا یا تبدیلی پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر ہم پہلے اپنے وجود پر نظر ڈالیں کہ کس طرح ایک بچے کی تخلیق ہوتی ہے۔ پھر وہ جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد مر جاتا ہے اور مرنے کے بعد زندگی۔ یہ زندگی کی مختلف کیفیات ہیں۔ اس طرح رات اور دن کی مختلف کیفیات یا کائنات میں نئے نئے ستاروں اور سیاروں کی دریافت یا ہماری زمین میں نئی چیزوں کی دریافت یا ایجاد وغیرہ سب پر تحقیق کرنے کے بعد ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تبدیلی یا تغیر ہر شے یا ہر چیز پر لازمی ہے، چاہے وہ نباتات ہوں یا جمادات، حیوان ہو یا انسان، خلقیات ہو یا فلکیات، تعمیر ہو یا تعلیم، یہ تغیر یا تبدیلی وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ بدل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور اسی علم کے ذریعے ہم ہر چیز کو نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ پُرانے علوم پر غور و فکر اور تحقیق کر کے اُن سے نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ جو لوگ ان راہوں پر چلیں گے وہ ہر وقت نئے اور جدید کہلائیں گے اور جو صرف روایت پر منحصر رہیں گے وہ منجمند ہو جائیں گے اور زمانہ ان لوگوں کو ٹھکرائے گا کیونکہ ان میں کوئی نیا پن یا جدت نہیں ہوگی۔

لفظ ''جدیدیت'' ایک عربی لفظ ہے، یہ لفظ اسم ہے اور مونث ہے جو لفظ جدید سے نکلا ہے۔[1] جدیدیت کے لغوی معنیٰ ''نیا پن، جدید ہونے کی کیفیت ہے''۔[2]

کیفیت کے لغوی معنیٰ ''حالت احوال، حقیقت عالم، رنگ و ڈھنگ، شرح، تفسیر، تشریح''۔[3]

کیفیت کے لغوی معنیٰ پر بحث کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ''جدیدیت'' دراصل ''جدید'' کی مکمل تشریح، تفسیر، شرح یا حقیقت بیان کرنے کے لئے ڈھالا گیا ایک نیا لفظ

۱: جامع فیروز اللغات اُردو، ص ۴۵۵۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷۳۔

ہے۔جس کا مقصد لفظ ''جدید'' کو ایک نئے رنگ و ڈھنگ میں پیش کرنا اور اس کے معنی کو وسعت دینا ہے، بلکہ اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ لفظ ''جدید'' کو فلسفیانہ بنانا ہے۔اسی لئے لفظ ''جدید'' کو نئے رنگ میں رنگنے کے لئے، زمانے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملانے کے لئے، وسعت، گہرائی، گیرائی اور فلسفیانہ لفظ بنانے کے لئے ''جدید'' کے ساتھ ''یت'' لفظ ملایا گیا، جس سے ایک نیا لفظ وجود میں آیا، جس کو ''جدیدیت'' کا نام دیا گیا۔اس کو ہم اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں۔

جدید + یت = جدیدیت

لفظ ''جدیدیت'' اور لفظ ''جدید'' کو سمجھنے سے پہلے ہمیں ''یت'' کو سمجھنا ہے، اُردو لغات میں، لفظ ''یت'' کہیں نہیں آیا ہے، تاہم ''یت'' کے انگریزی مترادف ''ISM'' کو اگر جاننے کی کوشش کی جائے، کیونکہ اگر کوئی اردو لفظ ''یت'' یا ''یات'' پر ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس کا آخری حرف ''ت'' ہوتا ہے، تو اس کا انگریزی مترادف لفظ ''ازم'' ''ISM'' پر ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس کا آخری حروف ''M'' یا ''میم'' ہوتا ہے۔جیسے مندرجہ ذیل یہ الفاظ:۔

نمبر شمار	اردو الفاظ	انگریزی مترادف
۱	اشتمالیت	Communism (کمیونزم)
۲	رومانیت	Romantism (رومینٹزم)
۳	مارکسیت	Marxism (مارکس ازم)
۴	اشتراکیت	Socialism (سوشل ازم)
۵	جمہوریت	Secularism (سیکولر ازم)
۶	انتقادیات	Criticism (کرٹی سزم)
۷	جدت	Modernism (ماڈرنزم)

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثر جس لفظ کے آخری میں ''یت'' یا ''یات'' یا ''ت'' آتا ہو اُس کا انگریزی مترداف ''ISM'' پر ختم ہو جاتا ہے یا انگریزی میں اس کا مترداف ''M'' ''میم'' پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں لفظ ''ISM'' ہمارے لئے ایک غیر معمولی لفظ بن گیا ہے کیونکہ ''یات'' یا ''یت'' کا اصل مفہوم اور معنی اسی ''ISM'' میں پوشیدہ ہے اس لئے اب لفظ ''iSM'' کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

1. ISM:- ISM (IZM) any distinctive doctrine in which people believe. Various ISM, various doctrines

نظریہ، عقیدہ، مختلف عقاید یا نظریات[1]

2. ISM:- ISM (IZM) (making abstract nouns

i. State or quality یت , Heroism بہادری

ii. System of thought Communism یت، اشتمالیت[2]

لفظ ''ازم'' ایک ایسا مخصوص نظریہ یا عقیدہ ہے جس پر لوگ یقین یا بھروسہ کرتے ہیں یا کوئی ایسی حالت یا کیفیت جس سے انسان متاثر ہو جائے یا با قائدہ، با اصول، منظّم نظام یا دبستان (System of thought or School of thought) جس سے کسی کی سوچ یا خیال مرتب، تبدیل یا متاثر ہو یا کوئی ایسی تحریک جس میں حکمت و دنائی یا علم ہو اور جس کے اثر سے انسان میں تبدیلی آجائے اور وہ اُس کا طالب بن جائے۔

اس طرح لفظ ''ازم'' ''ISM'' کسی نظرئے یا خیال یا تحریک کو فلسفہ بناتا ہے، گویا جس شخص یا تحریک کے نام کے پیچھے ''ازم'' ''ISM'' لگ جائے وہ نام ایک مکمل اور با قائدہ فلسفہ بن جاتا ہے۔

---

1. Twentyfirst Century Practical Advanced Dictionary, English Into Engish into Urdu, p. 365.
2. Ibid

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ''ازم'' ''ISM'' فلسفہ ہونے کا ایک نشان ہے اور ''ازم'' کا مترادف اردو زبان میں ''یت'' یا ''یات'' ہے اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس لفظ کے آخر میں ''یت'' یا ''یات'' آجائے اس لفظ میں فلسفہ پوشیدہ ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلسفہ کیا ہے؟ فلسفہ ''لاطینی'' (Latin) زبان کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ایک لفظ کا نام ''فائلو'' اور دوسرے لفظ کا نام ''سوفیا''۔ فائلو کے معنی محبت کے ہیں اور سوفیا کے معنی عقل مندی کے ہیں۔ اس طرح فائلو سوفیا یعنی فلاسفی (Philosophy) کا مطلب ہوا عقل مندی کی محبت ۔ ایک بار سقراط (Socrets) سے گلیکن (Galiacan) نے پوچھا کہ صحیح معنوں میں فلسفی کس کو کہتے ہیں، تو سقراط نے جواب دیا تھا کہ وہ جن میں سچائی کو دیکھنے کی خواہش یا آرزو ہوتی ہے اگر سقراط کے اس قول پر غور کیا جائے تو سچائی سے اسی کو محبت ہوگی جو عقل مندی سے محبت رکھتا ہو۔ فلسفہ کیا ہے؟ اس سے لفظ ''یت'' کی معنویت میں وسعت پیدا ہوئی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ''جدیدیت''، اشتراکیت اور اشتمالیت، یا کسی اور 'یت' کی طرح ایک فلسفہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

ہمارے پاس دو قسم کے علوم ہیں ایک وہ علم جو ماضی سے حاصل کیا یا جو ہم کو ماضی سے ملا ہے یا جو سرمایہ ہمارے پاس ہمارے بزرگ چھوڑ گئے ہیں اور دوسرا وہ علم جو ہمارے پاس حال کا ہے یا جس کو ہم موجودہ علم کہہ سکتے ہیں ہمیں ان دونوں علوم کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانا ہے، ان کا تقابلی مقابلہ کرنا ہے اور ان کی مکمل جانچ پڑتال اور پرکھ یا مکمل تفتیش کرنی ہے اس کے لئے محنت اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ جدیدیت دراصل جدید اور قدیم یا روایت اور جدت کی آمیزش وآویزش ہے۔

لفظ ''جدیدیت'' ایک ضمنی لفظ ہے بلکہ بنیادی لفظ ''جدید'' ہے اور جدیدیت، جدید ہونے کی کیفیت کا ایک فلسفہ ہے یہی وجہ ہے کہ ''جدیدیت'' کے بارے میں ''لغات'' اور

''انسائیکلو پیڈیاز'' میں بہت کم اور اگر یوں کہے تو غلط نہ ہوگا کہ نہ ہونے کے برابر لکھا گیا ہے، صرف ایک لغت ''جامع فیروز اللغات اردو، ص ۴۵۵'' پر جدیدیت کے معنی دئے گئے ہیں، مگر اس میں بھی جدیدیت کو انگریزی لفظ ماڈرنزم (Modernism) کے مترادف قرار دیا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ پھر بھی مولوی فیروز الدین نے باقی لوگوں کے برخلاف کوشش کی ہے، اسی طرح انسائکلو پیڈیا (اردو) میں بھی لفظ جدیدیت نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ ان میں بھی جدیدیت کو تقریباً ماڈرنزم کے مفہوم ہی میں لیا گیا ہے۔ تاہم جامع اردو انسائکلو پیڈیا ۳ سماجی علوم، ص ۲۲۰ پر دھبے دھبے اور رواروی میں جدیدیت کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، مگر وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جدیدیت کا صحیح مفہوم آنے والی نسل تک پہنچے اسلئے یہاں لفظ ''جدیدیت'' سے پہلے لفظ ''جدید'' کو سمجھا جائے اور ''جدید'' کے معنی مختلف لغات میں یہ دئے گئے ہیں۔

جدید:۔ نیا، تازہ، حال کا، اب کا۔[۱]

جدید:۔ نیا، تازہ، حال کا۔[۲]

جدید:۔ نیا، نو۔[۳]

جدید:۔ تازہ، نیا، نئی، زمانہ حال کا، قدیم کی ضد۔[۴]

جدید:۔ Fresh, Modern, New۔[۵]

جدید:۔ Modern, Recent, Fresh, Newly cutoff, New۔[۶]

جدید:۔ نئی، نیا، تازہ، اب کا۔[۷]

۱: فرہنگ آصفیہ، جلد دوم، ص ۳۹۔

۲۔ نور اللغات، جلد دوم، ص ۳۸۲۔

۳۔ لغاتِ کشوری، ص ۱۸۹۔

۴۔ عصری لغت، ۱۱۴۔

۵۔ ڈکشنری ہندوستانی اینڈ انگلش، ص ۲۸۳۔

۶۔ انسائیکلو پیڈیک ڈکشنری آف اُردو، ہندی اینڈ انگلش، جلد ۲، ص ۳۷۸۔

۷۔ جامع فیروز اللغات اردو، ص ۴۵۵۔

لفظ ''جدید'' کے معناں مندرجہ بالا تمام لغات میں تقریباً ایک جیسے دئے جا چکے ہیں اور وہ ہے نیا، تازہ، اب کا یا حال کا (New, Fresh) وغیرہ وغیرہ۔ ان معنوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ''جدید'' کے معنی ''نیا'' کے ہیں اور جسے دور حاضر تسلیم کرے۔ لفظ ''جدیدیت'' ''جدید'' ہونے کا ایک ''فلسفہ'' ہے جو انسان کو ہمیشہ حال کے ساتھ چلنے کا سبق پڑھاتا ہے اور انسان کو نیا بننے اور نئے کے ساتھ رشتہ رکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ جدیدیت کے معنی انگریزی میں ''ماڈرنٹی'' (Modernity) کے ہیں۔

جدیدیت کی ابتدا مغرب سے ہوئی، جب جدیدیت یا Modernity کا شعور لوگوں میں پیدا ہو رہا تھا، تب مغرب میں اسے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح بھی رائج تھی، جس کو ''جدت پرستی'' یا ''جدید پرستی'' یا (Modernism) کہتے تھے۔

معروف تنقید نگار modernity سے کیا مراد لیتے ہیں؟ ملاحظہ کیجئے:۔

پروفیسر آل احمد سرور رقمطراز ہیں:۔

''Modernity کو جدیدیت اور Modernism کو میں جدت پرستی کہوں گا''[1]

ڈاکٹر ممتاز الحق اس کے معنی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''ایک فلسفے کے طور پر جدیدت کی ابتداء مغرب میں ہوئی، اُس وقت وہاں جدیدیت (Modernity) سے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح جدید پرستی بھی رائج تھی''[2]

یوسف جمال خواجہ یوں لکھتے ہیں:

''جدیدیت (modernity)، جدید پرستی (Modernism) سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتی ہے''۔[3]

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب: آل احمد سرور، ص ۱۷۔

۲۔ جدید غزل کا فنی، سیاسی، سماجی مطالعہ، ص ۱۴۔

۳۔ جدیدیت اور ادب، مرتب: آل احمد سرور، ص ۲۹۔

پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر ممتاز الحق اور یوسف جمال خواجہ کے ان بیانات کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''جدیدیت'' کے معنی انگریزی زبان میں ''ماڈرنزم'' (Modernism) کے بجائے ''ماڈرنٹی'' (Modernity) اس لئے رکھا گیا ہے، کیونکہ اسی زمانے میں جب جدیدیت کی ابتداء مغرب میں ہو رہی تھی، اس سے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح ''جدت پرستی'' یا ''ماڈرنزم'' (modernism) وہاں پر پہلے سے ہی رائج تھی، جدیدیت ایک نئی چیز تھی جس کا جدت پرستی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ کیونکہ بقول یوسف جمال خواجہ، ''جدیدیت، جدت پرستی سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتی ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو ایک الگ نام ماڈرنٹی (modernity) دیا گیا ہے۔

اسلئے یہاں پر اس بات سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ''جدیدیت'' کے ''یت'' کے اعتبار سے انگریزی مترادف کے آخر میں ''ازم'' (ISM) کیوں نہیں ہے۔ اس کو اور بہتر پروفیسر مشیر الحق نے سمجھایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ماڈرن (Modern) کے مفہوم کو ہم اردو میں عام طور سے 'جدید' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں۔ اور اسی کی پیروی میں ''ماڈرنزم'' (Modernism) تجدید پسندی اور ''ماڈرنسٹ'' (modernist) تجدد پسند جاتا ہے، اس انداز پر اگر ہم ماڈرنٹی (Modernity) کے لئے اردو کا کوئی لفظ ڈھالنا چاہیں تو وہ جدیدیت ہوگا''۔[1]

اس طرح اب ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ کیونکر ''ماڈرنٹی'' کے لئے ''جدیدیت'' کا لفظ اردو میں ڈھالا گیا۔ چونکہ اردو ایک نئی زبان ہے، جس کی عمر تقریباً تین سو سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ اس نے تقریباً تمام بڑی زبانوں، جیسے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ سے اثر قبول کیا ہے۔ جب اردو کا لغت ترتیب دیا گیا، تب اس کے مولفین نے اس کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے الفاظ کے مترادفات کو بڑی دیدہ ریزی اور سوچ سمجھ کر برتنے کی کوشش کی،

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب: پروفیسر آل احمد سرور، ص ۴۷۔

یہی وجہ ہے کہ یہ کم عمر زبان بہت جلد مقبول ہوگئی۔ جیسے انگریزی کا ایک لفظ سیولیزیشن (Civilization) ہے، اس کا مترادف اردو میں 'تہذیب' رکھا گیا، جو اس کے ترجمہ کاروں اور ترتیب کاروں کی دانشمندی کا پکا ثبوت ہے یہی وجہ ہے جب لفظ ''ماڈرنٹی'' (Modernity) کے لئے اردو میں لفظ کو برتنا پڑا ہوگا، تو اس کے وسیع اور ہمہ گیر معنی کو نظر میں رکھتے ہوئے اور ماڈرن (Modern) کے معنی ''جدید'' اور ''ماڈرنزم'' (Modernism) کے معنی جدت پرستی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور اسکو اردو زبان و ادب میں وہی معیار دینے کے لئے جو اس کو انگریزی میں ہے، اسکے لئے ایک وسیع اور ہمہ گیر معنی والے مترادف ''جدیدیت'' سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں پایا گیا۔ کیوں کہ لفظ جدیدیت میں فلسفے کو بہتر ڈھنگ سے پیش کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ماڈرنٹی (Modernity) کے لئے لفظ ''جدیدیت'' اردو میں ڈھالا گیا۔

جہاں ہم نے جدیدیت کو مذہبی، لسانی اعتبار سے سمجھنے کی کسی حد تک کوشش کی، وہیں اس کو ادبی اعتبار سے سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر میں جانا بے حد ضروری ہے۔ ''جدیدیت'' کی ابتداء مغرب سے ہوئی، جب ''جدیدیت'' یا ماڈرنٹی'' (Modernity) کا شعور لوگوں میں پیدا ہو رہا تھا، تب مغرب میں اس سے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح بھی رائج تھی جسے ''جدت پرستی'' (modernism) کہا جاتا تھا، مگر دونوں اصطلاحوں میں کافی فرق ہے اور دونوں کے معنی اور نظریات مختلف ہیں اگر یوں کہیں تو یہ غلط نہیں ہوگا کہ کسی حد تک ہم نام یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جدیدیت یا (Modernity) کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں Modernity اور Modernism میں فرق کرنا پڑے گا، Modernity کو میں جدیدیت اور modernism کو میں جدت پرستی کہوں گا۔ جدت پرستی میں دو پہلو ایسے ہیں

جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ اصطلاح ابتداء میں کلیسا کے حلقوں میں مذہبی اصلاح کے لئے استعمال کی گئی، جس میں روایت کے بجائے عقل پر زیادہ زور تھا۔ دوسرے اس میں جدیدیت کے علاوہ موجودہ دور کے سائنسی یا صنعتی کمالات، تیکنولوجی کی پرستش اور جدید نظریات کی آنکھ بند کر کے تقلید کا پہلو بھی ہے اور نئے کی اس لئے ستائش ہے کہ وہ نیا ہے۔''[1]

پروفیسر آل احمد سرور کے اس بیان کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''جدیدیت'' (Modernity) اور ''جدت پرستی'' (Modernism) دو الگ الگ اور متضاد اصطلاحیں ہیں، جدیدیت کو سمجھنے سے پہلے جدت پرستی کو سمجھنا بے حد ضروری ہے، پروفیسر آل احمد سرور نے (Modernism) کو جدت پرستی کا نام دیا ہے اور اسے مندرجہ ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ جدت پرستی کی اصطلاح ابتداء میں کلیسا کے حلقوں میں مذہبی اصلاح کے لئے استعمال کی گئی جس میں روایت کے بجائے زیادہ زور عقل پر تھا۔

۲۔ جدت پرستی میں جدیدیت کے علاوہ موجودہ دور کے سائنسی یا صنعتی کمالات تیکنالوجی کی پرستش اور جدید نظریات کی آنکھ بند کر کے تقلید۔

سب سے پہلی بات جو یہاں پر جدت پرستی کے لئے نمایاں ہو رہی ہے، وہ ہے ''مذہبی اصلاح'' اور دوسرے ''آنکھ بند کر کے نئے یا جدید نظریات کی تقلید''۔ یہاں پر اگر اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک مخصوص نظریہ ہے، یعنی اس کی گہرائی اور وسعت بہت محدود ہے، جناب ممتاز حسین اس کو ادبی نظریہ کے بجائے تاریخی نظریہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر چند کہ لغوی حیثیت سے 'جدید' کے معنی نئے کے ہیں، لیکن اصطلاحی معنی مختلف

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب: پروفیسر آل احمد سرور، ص ۱۷۔

ہیں، اس کا ایک تاریخی حوالہ ہے۔ تاریخ کا کوئی بھی طالب علم جانتا ہے کہ ماڈرن یورپ کے کیا معنی ہیں۔ یہ لفظ سترھویں صدی کے اس یورپ کے بارے میں استعمال کیا جاتا ہے، جس نے نشاۃ ثانیہ اور پروٹسٹنٹ تحریک کے جلو میں نئے سائنسی علوم وفنون سے استفادہ کرتے ہوئے قدیم جاگیردارانہ عہد کے نہ صرف سکونی تصور حیات وکائنات کو رد کر دیا تھا، بلکہ استناد پرستی کے خلاف انفرادی ضمیر اور عقل کی پرستش شروع کر دی تھی۔''[1]

ایک زمانہ تھا جب عیسائیت میں زبردست تنگ نظری تھی اور کلیسا کو زبردست اختیارات حاصل تھے' عیسائیوں کو جو ارتداد کا شکار ہوتے تھے سخت ترین عذاب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی ابتداء پوپ گریہ گوری نہم کے عہد میں ہوئی، جنہوں نے جنوبی فرانس کے ایک خفیہ مرتد گروہ کے بارے میں تحقیق کا حکم دیا۔ وہ کام جو مقامی پادری کرتے تھے، وہ خود پوپ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس کے بعد سے احتساب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پوپ کا مقرر کیا ہوا محتسب جب کسی جگہ جاتا وہاں تمام مرتدوں کو اس کا موقع دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں۔ اقبال جرم کرنے والوں کو تھوڑی سی سزا دی جاتی، لیکن جو اقرار نہ کرتے، اُن کے خلاف تحقیق شروع ہوتی۔ مرتدوں کو ان کا نام نہیں بتایا جاتا تھا، جو اُن پر الزام لگاتے تھے۔ ۱۲۵۴ء کے بعد اس میں ایک نیا رنگ آ گیا اب مُرتد کو خود جواب دینا پڑتا تھا، وہ کوئی وکیل نہیں رکھ سکتا تھا، البتہ سزا کے خلاف پوپ کے یہاں اپیل کر سکتا تھا۔ یہ مقدمات خفیہ ہوتے اور مجرموں کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان کی جائیداد ضبط کر لی جاتی، بعض صورتوں میں مرتد کو زندہ جلایا جاتا تھا۔ شروع میں یہ صرف جنوبی فرانس تک محدود تھا لیکن بعد میں شمالی اٹلی، جرمنی وغیرہ میں بھی پھیل گیا اور یہ طریقہ انیسویں صدی تک باقی رہا۔

۱: سہ ماہی ''فنون''، جدید غزل نمبر، جلد اول، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۳۲۔

احتساب کی ان سزاؤں میں ہسپانیہ سب سے زیادہ مشہور تھا۔ ۱۴۷۸ء میں وہاں کے ایک بادشاہ فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ نے پوپ کو بالائے طاق رکھ کر، احتساب کے یہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے، اس احتساب کا مقصد دراصل یہ تھا کہ اُن مسلمانوں کا پتہ لگایا جائے جنہوں نے عیسائیت خلوص کے ساتھ قبول نہیں کی۔ بلکہ جبر وخوف کی وجہ سے عیسائی بنے اور پھر اُن کو زبردست سزائیں دی جاتیں۔ اُن کے بچے اُن سے چھین لئے جاتے اور اُن کو زندہ جلایا جاتا تھا، یہاں تک کہ اُن کی عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی تھی۔

ہسپانیہ، جرمنی، اٹلی، فرانس، برطانیہ جیسے ممالک میں پادریوں کو سخت ترین اختیارات حاصل تھے۔ وہ جس کو چاہتے سزا دے سکتے تھے۔ استناد پرستی کا ایک عجیب وغریب رواج ان پادریوں نے رائج کیا تھا۔ جو کوئی شخص اثر ورسوخ والا ہوتا یا جس کے پاس روپے پیسے یا کوئی دھن دولت جیسے سونا، چاندی، ہیرے وغیرہ ہوتے، وہ اپنی اس دھن و دولت کو کسی گرجہ کے پادری کو دیتا اور بدلے میں جنت کی سند حاصل کرتا تھا۔ یعنی پوپ یا باقی پادریوں کو حق حاصل تھا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو جنت کی سند عطا کرتے، جس کے پاس دھن و دولت ہوتی تھی، جو ایک بیوقوفانہ فعل تھا اور کوئی بھی عقل مند انسان اس کو بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں کہے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے کام تھے، جو خلاف عقل ہوتے، مگر اُن میں کلیسا کا کردار اہم ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کی آخری دھائی اور انیسویں صدی کے اوائیل میں اس بدعت اور بے وقوف نظریے کے خلاف تحریک چلی اور جو بعد میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر تک ماڈرنزم (Modernism) کے نام سے مقبول ہوتی گئی۔ جیسا کہ ڈاکٹر ممتاز الحق لکھتے ہیں۔

> ''ایک فلسفے کے طور پر جدیدیت کی ابتداء مغرب میں ہوئی، اس وقت وہاں جدیدیت (modernity) سے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح جدید پرستی (modernism) بھی رائج تھی۔ جدید پرستی کی اصطلاح کا استعمال اُنیسویں صدی

کے اواخر میں پروٹسٹنٹ عیسائیت کے ایک طبقے میں زور پکڑتی ہوئی لبرل تحریک کے لئے ہوتا تھا اس طرح جدید پرستی کا تعلق عیسائیت کے جدید تصور سے ہے۔ جب کہ جدیدیت کا مفہوم زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے دائرے میں مذہب ہی نہیں بلکہ پوری زندگی آجاتی ہے اور یہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جدید تصورات کو زندگی کے ہر شعبہ میں ترجیح دی جانی چاہئے۔''[1]

عیسائی مذہب میں ہونے والی اندھی تقلید اور بدعات کے خلاف ایک آواز، جو انیسویں صدی میں اُٹھی تھی، آہستہ آہستہ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک تحریک بن کر سامنے آئی اور جس نے عیسائی کلیسا کو کئی اور حصوں میں تقسیم کیا، اس کا مقصد صرف اور صرف عیسائی حلقوں میں مذہبی اصلاح کرنا تھا اور نئے یا جدید نظریات کی آنکھ بند کر کے تقلید کرنا تھا اور اس کا تعلق صرف مذہب سے تھا، نہ کہ زندگی کے باقی شعبہ جات سے، یہ تحریک مذہب میں اندھے قانون کے خلاف تھی، کیونکہ اسے باقی مذاہب کے مقابلے میں عیسائیت کی ساخت کو بُری طرح نقصان پہنچ رہا تھا۔ یہی وجہ تھا کہ اسکے خلاف احتجاجی اُٹھ کھڑے ہو گئے اور ان کو احتجاجی عیسائی یا پروٹسٹنٹ کرسچن (Protestant Christian) کا نام دیا گیا اور آہستہ آہستہ یہ ایک تحریک میں تبدیل ہوتی گئی اور انہوں نے اپنا ایک الگ کلیسا پروٹسٹنٹ چرچ (Prostentant Church) یا احتجاجی کلیسا اختیار کیا۔ ۱۵۲۹ء میں عیسائی مذہبی رہنماؤں کی ایک کانفرنس میں اکثریت نے یہ فیصلہ دیا کہ اب عیسائی مذہب میں کسی قسم کی تجدید کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن کلیسا کی غلط کاریوں اور مذہب میں بڑھتی ہوئی خرابیوں اور بدعات کے خلاف ایک جماعت نے اجتہاد پر زور دیا اور یہی اجتہاد چاہنے والے پروٹسٹنٹ کہلانے لگے۔ یہ مذہب عام طور پر رومن کیتھولک اور دوسرے عیسائی مذہب سے الگ سمجھا جاتا ہے۔ شروع میں اس کی خصوصیت یہ تھیں کہ اسے

۱: جدید غزل کا فنی، سیاسی، سماجی مطالعہ، ص ۱۴۔

بائبل پر پورا اعتقاد تھا اور یہ مانا جاتا تھا کہ وہی سچائی کو اشکار کرنے کا واحد وسیلہ ہے۔ اس مذہب کے تمام پیروؤں کو مذہب کی تفسیر کرنے کا یکساں حق دیا ہے۔ یعنی ہر پیرو ایک پادری بھی ہے۔ ساتھ ہی ہر انسان صرف خدا پر عقیدے کے ذریعہ سے ہی تعلق قائم کر سکتا ہے، نہ کہ چرچ کے بنائے ہوئے اصولوں کی مدد سے۔ اس فرقہ میں دینیات کی کتابوں پر توجہ کم دی جاتی تھی، اس پروٹسٹنٹ تحریک کے بھی آہستہ آہستہ فرقے ہوتے گئے اور ان کا ماڈرنزم (modernism) کا نظریہ کئی اور نظریوں میں تبدیل ہوتا گیا اور اس کے کئی الگ ہونے والے فرقوں میں ایک فرقہ مقبول ہو گیا۔ جس نے اپنا الگ کلیسا بنایا۔ جس کو میتھو ڈسٹ چرچ (Methodist Church) کا نام دیا گیا۔ یہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کہ وہ شاخ ہے، جس میں عیسائی مذہب کے نظریوں اور طریقوں اور عبادت کے بارے میں جان وزلے (John Wesley) کی تعلیمات کی پیروی کی جاتی ہے، جان وزلے اور اس کے بھائی چارلس نے کچھ ہم خیال لوگوں کو لے کر ایک گروہ بنایا۔ انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ اپنی زندگی اور مذہبی مطالعہ کو قائدے اور اصول (Rule and Method) کے مطابق ڈھالیں گے اور اسی وجہ سے ان کا نام ''میتھو ڈسٹ'' (Methodist) پڑ گیا اور ان کا نظریہ یا فلسفہ ''میتھو ڈزم'' (Methodism) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ میتھو ڈزم (methodism) کا فلسفہ بھی پروٹسٹنٹ فلسفے کا ایک پہلو ہے۔ پروٹسٹنٹ کا فلسفہ مذہبی حلقوں کی اصلاح اور سائنس اور تیکنالوجی کی آنکھ بند کر کے تقلید ہے۔ اس فلسفہ یا نظریات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ابھرتی ہوئی وہ لبرل تحریک، جس نے احتجاجی عیسائیت کے ایک طبقے میں جنم لیا ''جدید پرستی'' یا ''جدت پرستی'' یا ''ماڈرنزم'' (Modernism) کہلاتی ہے۔ جیسا کہ خواجہ یوسف جمال لکھتے ہیں۔

> ''جدید پرستی'' (modernism) کا لفظ، موجودہ مفہوم میں سب سے پہلے انیسویں صدی کے آخری دہے میں قدامت پسند کیتھولک کلیسا کے حلقوں میں استعمال کیا

گیا۔ اس لفظ سے وہ ابھرتی ہوئی لبرل تحریک مُراد لی جارہی ہے، جو پروٹسٹنٹ عیسائیت کے ایک طبقہ میں زور پکڑ رہی تھی، اسی طرح جدید پرستی کو مذہب کی کائنات سے جوڑ دیا گیا تھا۔ اگر چہ اس لفظ کا استعمال کبھی بھی خالص مذہبی مفہوم میں محدود نہیں رہا، لیکن جدید پرستی سے بالعموم مذہبی جدیدیت یا عیسائیت کا جدید تصور ہمیشہ کسی نہ کسی طرح منسلک رہا ہے۔ جدیدیت (modernity)، جدید پرستی (modernism) سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتی ہے''۔[1]

مندرجہ بالا نظریات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جدت پرستی یا جدید پرستی (Modernism) دراصل اُن رسومات یا بدعات اور متعصب نظریات کے خلاف ایک تحریک تھی جو مذہبی حلقوں (عیسائیت کے حلقوں) میں ہوتی رہی ہے اور یہ تحریک آہستہ آہستہ مقبول ہوتی گئی مگر اس نظرئے کا تعلق صرف مذہب سے تھا، بلکہ زندگی کے باقی معاملات یا شعبہ جات سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظریہ تنگ نظری کے خلاف شروع ہوا تھا، جو خود تنگ نظری کی وجہ سے ''جدیدیت'' کے مقابلے میں بالکل ناکام رہا۔ جدیدیت ہمہ گیریت اور وسعت نظری کی وجہ سے جدت پرستی سے کافی وسیع اور ہمہ گیر مفہوم رکھتی ہے، جدت پرستی کو ایک مسلک قرار دیا گیا اور جدیدیت ایک خصوصیت ہے، جدت پرست ہر نئی چیز کی بڑی قدر کرتا ہے اور ہر پُرانی چیز کو ناپسند، اس کے بجائے جدیدیت ایک مظہر ہے، جس کے اچھے پہلو بھی ہیں اور بُرے بھی، یہ پرانی چیزوں کو ناپسند نہیں کرتی، بلکہ اُن سے گرد و غبار اُٹھا کر اُن کو آگے لے آتی ہے۔ جدیدیت اگر چہ کافی حد تک مغربیت سے مشابت رکھتی ہے، مگر مغربیت نہیں ہے۔ اس سے مشہور نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے مغربی نقاد وِٹ فوگل (Wit Fogel) کے حوالے سے نہایت بہتر طریقے سے یوں سمجھایا ہے۔

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب: آل احمد سرور، ص ۱۷۔۱۸۔

''جدیدیت کے عمل کو میں جدید کاری کہوں گا۔ جدید کاری یا (modernization) کو مغربیت (Westernization) کے مترادف سمجھا گیا ہے۔ جدید کاری بڑی حد تک مغرب کے راستے پر چلنے کا نام ہے، مگر دونوں ایک ہی چیز نہیں ہے۔ جیسا وِٹ فوگل نے کہا ہے 'ہم جدید کاری اور مغربیت کو ایک لکیر کی طرح شروع ہو کر الگ اور متوازی خطوط کا نام بھی دے سکتے ہیں'۔ بہر حال یہ واقع ہے کہ عام طور پر دونوں کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا ہے اور اسی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں''۔[1]

جدید کاری اور جدیدیت دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں، مترادف نہیں، قریب کیسے ہیں اور مترادف کیسے نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مغرب اور مشرق میں کافی فرق ہے اور جدیدیت مشرق میں مغرب کے مقابلے میں کمزور ہے، مگر نایاب نہیں اور مغرب میں کافی مقبول، مگر مغربیت (Westernization) نہیں۔ مانا کہ یہ مغرب میں تیار ہوئی اور وہی سے پل بڑھ کر مشرق میں داخل ہوئی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ مغربیت کے مترادف ہے۔ مغرب نے از منہ وسطیٰ میں مغرب بالخصوص ہسپانیہ (جنہوں نے اپنا سارا علم عرب سے حاصل کیا تھا) سے بہت سارا علم حاصل کیا تھا اور انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ مغربیت، عربیت کے مترادف ہے۔ جدید کاری (modernization) جیسے پروفیسر آل احمد سرور نے مغربیت (Westernization) کے راستے پر چلنے کا نام دیا ہے۔ دراصل جدید کاری عمرانیات (Sociology) کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ترقی پزیر ممالک سماجی تبدیلی کے ذریعے سے اپنے اندر ترقی یافتہ ممالک کے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ گو کہ جدید کاری کے لوازم اور جدیدیت کے معیار کے باب میں کوئی متفقہ رائے نہیں ملتی، تاہم اس کے ماہرین کی تصفیات کی روشنی میں اسکے چند بنیادی نکات درج ذیل ہیں!

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب: آل احمد سرور، ص ۲۰۔

۱۔ جدیدیت کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ ملکی معیشت میں کسی نہ کسی حد تک مستقل ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ یا کم از کم اتنی ترقی ہوتی ہے کہ اس سے پیدائش وصرف میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ سیاسی نظام عوامی شرکت پر مبنی ہوتا ہے، یا کم از کم مقنّنہ (قانون ساز اسمبلی یا Legislation) سطح پر عوامی نمائندگی پائی جاتی ہے۔

۳۔ قومی تہذیب وثقافت میں لامذہبیت اور عقلیت پسندی کے اصول کارفرما ہوتے ہیں۔

۴۔ معاشرہ میں نقل وحرکت کی آزادی کا فروغ یعنی ہر شخص کو جسمانی، سماجی اور نفسیاتی طور پر نقل وحرکت کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔

۵۔ مذکورہ بالا نکات کے مطابق افراد کے رجحانات اور رویوں میں تبدیلی ہو، تا کہ وہ تبدیل شدہ معاشرتی نظام میں بہتر طور پر کام کر سکیں۔[1]

مندرجہ بالا نکات عمرانیات (Sociology) نے جدیدکاری اور جدیدیت کے متعلق تجویز کئے ہیں، مگر خود یہ رائے رکھتے ہے کہ دونوں کے باب میں کوئی اتفاق نہیں ملتا۔ ایک بات یہاں یہ ثابت ہوتی ہے کہ اگر جدید کاری کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک اپنے اندر تبدیلی اور ترقی یافتہ ممالک کے اوصاف پیدا کریں، تو اسے مغربیت کیسے قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ مغرب تو دن دگنی اور رات چگنی ترقی کر رہا ہے اور ترقی پذیر ممالک ان کی ترقی دیکھ رہے ہیں، مگر ترقی کے سامان، مشینیں، آلات وغیرہ، غریبی کی وجہ سے خرید نہیں سکتے اور ترقی یافتہ ممالک ایک ایک چیز ترقی پذیر ممالک کو اتنے موٹے داموں فروخت کرتے ہیں کہ اگر وہ خریدنا بھی چاہیں، تو خرید نہیں سکتے۔ امریکہ تو خود ایک سپر پاور ملک ہے، لیکن کسی اور ملک کو سپر پاور بننے کی اجازت نہیں ہے، اپنی ترقی کے لئے اور جدید مسائل سے نمٹنے کے لئے ترقی یافتہ ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ نے تو کب کی ایٹمی بجلی بنائی اور یورینیم کی افزودگی کا حق صرف ان ترقی

۱: جامع اُردو انسائیکلوپیڈیا، ۳، سماجی علوم، ص ۲۲۰۔

یافتہ ممالک کو حاصل ہے، اگر ایران یورینیم کی افزودگی سے ایٹمی بجلی تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کے خلاف جنگ کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے، اسی طرح اگر کوئی ترقی پذیر ملک اپنے دفاع کے لئے کوئی ہتھیار بنانا چاہتا ہے، تو اُسے مغرب یہ کہہ کر روکتا ہے کہ یہ عالمی امن کے لئے خطرہ ہے، جب کہ خود اُن کے پاس ایسے زبردست ہتھیار اور خصوصاً تباہ کُن ایٹمی مزائل وغیرہ موجود ہیں، جو اُن کے مطابق عالمی امن کے لئے خطرہ نہیں۔ ایٹمی ہتھیار خود مغرب بنا سکتا ہے، مگر ایٹمی بجلی مشرق نہیں بنا سکتا، لیکن انہیں ایک رعایت یہ ملتی ہے کہ وہ تیل کو مغرب کو بھیجنے کے بعد جو کثافت بچ جاتی ہے، اس سے شمع کے لئے موم بنا سکتے ہیں۔ مشرق کو ایک ایک چیز بنانے سے پہلے مغرب کی اقوام متحدہ سے اجازت لینی پڑتی ہے، جس میں برسوں گزر جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں جن پر مغرب قابض ہے اور مشرق کو ان چیزوں کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں اس لئے عمرانیات (Sociology) کا یہ قصہ غلط ثابت ہوا ہے کہ ترقی پذیر ممالک اپنے اندر ترقی یافتہ ممالک کے اوصاف پیدا کریں۔ کیونکہ ترقی پذیر ممالک تو اسے گلے لگانے کے لئے تیار ہیں، مگر ترقی یافتہ ممالک ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ نعرہ بازی اور غلط پروپگنڈہ سے ایسی چیزیں حاصل نہیں ہوتیں۔ بلکہ یہ عملی جامہ پہنانے سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

ان معنوں میں ہم جدید کاری کو کسی حد تک جدیدت تو کہہ سکتے ہیں، مگر مغربیت نہیں کیونکہ مغربیت متعصب اور تنگ نظری کا ایک نام ہے اور جدیدت ایک وسیع، ہمہ گیر اور روشن خیال نظریہ ہے، جو کسی کی جائیداد نہیں، اسلئے ہمیں جدیدیت کو مغرب کے مترادف ٹھہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظریہ مغرب میں پروان چڑھا اور اس نظرے کی بدولت انہوں نے ترقی کی اور وہ ترقی کی نئی راہیں تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک مضمون ''مغرب میں جدیدیت کی روایت'' میں لکھتے ہیں:

''کپلنگ کا بدنام زمانہ قول'' مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کا

نقطہ اتصال کوئی نہیں'' ہندوستان اور یورپ دونوں کے دانش وروں کا ہدف ملامت رہا ہے اور اس میں کوئی شعبہ نہیں کہ جس جذبہ کے تحت یہ بات کہی گئی ہے۔ وہ یقیناً قابل اعتراض تھی۔ لیکن کپلنگ سے کوئی خاص ہمدردی نہ رکھتے ہوئے بھی میں یہ کہوں گا کہ مشرق اور مغرب کے قومی مزاج میں کچھ ایسے بنیادی اختلافات ہیں، جن کو کسی بھی صورت سے سلجھایا نہیں جا سکتا۔ مغرب میں توکل کا مادہ بالکل نہیں، مشرق کے فلسفے کی بنیاد توکل پر ہے۔ مغرب تجربہ اور تبدیلی کو خوش آمدید کہتا ہے مشرق تجربہ اور تبدیلی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اگر مغرب کا مزاج اضطراری، تو مشرق سکون و جمود کا اس حد تک متلاشی ہے کہ وہ ہر تجربہ کو بغاوت سے تعبیر کرتا ہے۔ مشرق اگر روایت پرست ہے، تو مغرب بغاوت پرست، ان بنیادی رجحانات کا اظہار مشرق و مغرب کے فنون لطیفہ میں بہت زیاد کھل کر ہوا ہے۔ مشرق کی موسیقی دھیمی، عام طور پر ہیجان سے گریزاں خواب ناک تاثر کی حامل ہے۔ مغرب کی اس کے برعکس ہے۔ یہی حال ادب کا بھی ہے، مغربی ادب میں ہر عہد نے ادبی اقدار کو نئے سرے سے سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں توڑ پھوڑ سے بھی گریز نہ کیا۔ لیکن عہد قدیم میں بنائے گئے اصول اور نظریات کی حکمرانی مشرق میں ایک عرصہ تک رہی اور ایک حد تک آج بھی ہے''۔[1]

شمس الرحمان فاروقی کے مندرجہ بالا بیان کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق کو بدلنا ہے اور اپنے آپ کو جدیدیت کے سانچے میں ڈھالنا ہے، اس سے پہلے ہم یہ بات تحریر کر چکے ہیں کہ جدیدیت، مغربیت کے مترادف ہے یا نہیں اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جدیدیت مغربیت کے مترادف نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے مضمون کا آغاز کپلنگ کی کہی گئی بدنام زمانہ بات سے کیا تھا۔ کپلنگ روڈیاڈ (Kipling Rudyard) اُس متعصب شخص کا نام ہے

۱: جدیدیت اور ادب، مرتب: آل احمد سرور، ص ۹۸۔

جوسفید فام اقوام کا زبردست حامی ہے۔اس نے ساری عمر سیاہ فام اقوام کی کمتری اور سفید فام اقوام کی ان پر حکمرانی کے جواز پر لکھنے پر صرف کی۔انگلستان کے اس باشندے کی ادبی زندگی کی ابتداء شاعری سے شروع ہوئی،اس کے بعد اس نے ہندوستان کے نظام زندگی کے متعلق کہانیاں لکھیں، جن میں ''پلین ٹیلس فرام دی ہلس'' (Plain tales from the hills) اور ''سولجرس تھری'' (Soliders three) مشہور ہیں۔اسکے علاوہ اس نے ایک ناول ''لایٹ دیٹ فیلڈ'' (Light that Failed) بھی لکھی۔ان تمام کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستانیوں کو ممکنہ حد تک بُری شکل، کم تر، کم نظر، کام چور، بد ذہن اور سفید فاموں کو اعلیٰ، بہادر، ذمہ دار اور ذہین بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اسکا یہی رنگ اس کی نظموں '' گنگا دین'' (Ganga dean) ''مانڈلے'' (Mandla) اور ''سفید فاموں کا بوجھ'' (Whitemans Burden) میں بھی جھلکتا ہے اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ پہلا انگلستانی ادیب تھا، جسے ادب کا نوبل انعام ۱۹۰۷ء میں دیا گیا۔مغرب کا ایک ایسا ادیب، جس نے تمام عمر مغربیوں کی حمایت، ہندوستانیوں کی ذلت اور رسوائی اپنی تحریروں کے ذریعے کی، کو ایک بڑا ادیب قرار دے کر مغرب اسے ایک جدید ادیب کی حیثیت سے یاد کرتی ہیں اور اُسے مغرب نوازں نے ادب کا نوبل انعام دیا، اس ادب کے عوض، جس میں اس نے مشرق کو حقیر نظر سے پیش کیا، میرے خیال میں اس بڑے اعزاز کا مستحق نہ تھا۔کیونکہ اس کی تحریروں کی بنیاد تعصب اور جھوٹ پر تھی۔جب کہ واقع یہ ہے کہ جدیدیت مغرب کے مترادف نہیں، بلکہ متخالف ہے اور یہ ایک ایسا وسیع نظریہ ہے، جس میں متعصب اور انتہا پسند لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔گزشتہ صفحات میں شمس الرحمان فاروقی کے مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے، جس میں موصوف نے مشرق کے لوگوں کو جمود اور سکون کی بناء پر قابل اعتراض قرار دیا ہے اُن کے نزدیک مشرقی عوام تغیر اور تبدیلی سے خائف رہتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے علم و دانش کے پس پشت مسلمانوں کے علوم سے استفادہ کی تحریک کارفرما ہے۔ مغرب کے پاس سکون کے وہ سامان میسر ہے، جو مشرق کے پاس نہیں، مغرب کو علم حاصل

کرنے کے نت نئے ذرایعے دستیاب ہیں، انہوں نے از منہ وسطیٰ کے مسلمانوں سے خاصا استفادہ کیا اور علم حاصل کر کے طاقت ور بن گئے اور مشرق اس غلط فہمی میں رہ گیا کہ ہمارے اجداد ایسے تھے ویسے تھے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے اسلاف پر نظر ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں، جب کہ دنیا بھر میں ہم نے حکومت کی تھی۔

جہاں مغربیت، مغرب کے نقش قدم اور ان کے طور طریقے پر چلنے کا نام ہے۔ وہیں جدت پرستی عیسائیت کے حلقوں میں مذہبی اصلاح یا جدید تصور کا نام ہے، جس کے ذریعے انہوں نے اپنے مذہب میں ترمیم یا نرمی سے کام لے کر اپنے مذہب کو Libralize کیا۔ بہ الفاظ دیگر اس میں سے پابندیاں ہٹا کر تعصب اور ضد یا (Narrowness) کو ختم کرنے کی کوشش پر زور دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے مذہب میں بقول ان کے، رواداری، آزاد خیالی اور بے تعصبی پیدا ہوئی۔ گویا کہ مذہب میں عقلیت پسندی سے کام لیا گیا، اسکے علاوہ جدت پرستی ہمیں سائنس اور تیکنالوجی کی آنکھ بند کر کے تقلید بھی سکھاتی ہے۔ جدت پرستی اور مغربیت کے بعد جدیدکاری بھی ایک فلسفہ ہے، جسے جدیدیت سے جوڑا جارہا ہے۔ اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ عمرانیات یا (Sociology) کا ایک علم ہے، جو جدیدیت سے متاثر ہے، نہ کہ جدیدیت اس سے متاثر اور اس علم کی سرحدیں سماج تک محدود ہیں۔ جبکہ جدیدیت ایک آفاقی موضوع ہے، جو زندگی کے تمام شعبہ جات کے بارے میں واقفیت اور علم رکھتا ہے اور اب یہ ایک انسان کی ذمہ داری ہے کہ اسے کس طرح استعمال کرے۔

''جدت پرستی'' (Modernism) ''جدیدکاری'' (Modernization)، ''مغربیت'' (Westernization)، کے برخلاف ''جدیدیت'' (modernity) کے معنان و مفہوم زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ اسکے دائرے میں مذہب ہی نہیں، بلکہ پوری زندگی آجاتی ہے اور یہ زندگی کے ہر پہلو کو نئے انداز سے دیکھنے کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔ جدیدیت، جدید پرستی کی طرح روایت کو

رد نہیں کرتی، روایت کی تقلید نہیں کرتی، بلکہ ایک اور نئی روایت پیدا کرتی ہے۔ جیسا کہ یوسف جمال خواجہ لکھتے ہیں:

''وسیع تر معنوں میں جدیدیت کے معنی یہ رہے ہیں کہ ہم عصر یا جدید رجحانات و میلانات کو روایتی اور قدیم اقدار پر زندگی کے ہر شعبے میں فوقیت دی جائے۔ چونکہ ہم عصر یا جدید کا مفہوم زمانہ کی اضافت سے ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ آج کی حقیقی جدیدیت کو جو لمحہ ماضی کا ایک حصہ بنتی جاتی ہے، گزرے ہوئے کل سے الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ حقیقی اور ٹھوس جدیدیت ایک نہیں کئی ہے۔ یہ سب زمانی و مکانی رشتوں سے متعین ہوتی ہے۔ جب کہ جدیدیت ایک مخصوص رویہ یا تصور کے مفہوم میں ابدی کہلائی جاسکتی ہے۔ اس کا تعلق ناظر کے زمانی رشتوں کے ساتھ محدود نہیں ہوتا''۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جدیدیت کسی ایک زمانے سے نہیں، بلکہ ہر زمانے سے متعلق ہے۔ حقیقی اور ٹھوس جدیدیت ایک نہیں، بلکہ کئی ہیں کا مطلب یہ ایک زمانے سے متعلق نہیں، بلکہ ہر زمانے سے متعلق ہے، یعنی ماضی، حال اور مستقبل سے۔ جس طرح حال کو ماضی سے الگ کرنا بے حد مشکل ہے۔ اسی طرح حال کو ماضی سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ حال سے مستقبل میں نہ جانا ناممکن ہے، آج کا حال کل کا ماضی اور آج کا مستقبل کل کا حال اسی طرح سے زمانہ اور زندگی ایک دوسرے کے ساتھ چلتے جائیں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس کو ایک الگ طریقہ سے سمجھانے کی کوشش میں ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جدیدیت ایک اضافی چیز ہے، وہ چیز جس کا تعلق کسی لمحہ کسی خاص زمانے یا دور سے ہوگا وہ اضافی ہوگی مطلق نہیں اس اعتبار سے جدیدیت کی کوئی ایسی تعریف

۱: جدیدیت اور ادب، مرتب پروفیسر آل احمد سرور، ص ۳۰۔

نہیں کی جاسکتی، جو دس سال بعد صحیح و درست ہو۔ آج کی جدیدت کل پرانی ہو جائے گی۔ جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا، ان ہی معنوں میں ہر جدید میں قدیم شریک رہتا ہے۔ روایت کے بھی یہی معنی ہیں۔ ہر نسل اپنی ذہنی و مادی ضرورتوں کو عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے معیار اور اپنے پیمانے خود مقرر کرتی ہے اور ان ہی پیمانوں سے اپنے دور کو اپنے ماضی کو اور اپنے ادب پاروں کو ناپتی ہے، ماضی اور اس کے وہ ادب پارے جن میں اس سے اپنے طرز احساس، انداز فکر کا شعور اور عکس نظر آتا ہے، وہ اپنے سینے سے لگا کر اپنے معیاروں کے پیش نظر انہیں نئے معنی دے دیتے ہے اور باقی کو رد کر دیتی ہے۔ فکری سطح پر دھوپ چھاؤ کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ان میں ہم ہر نسل کے ایسے معیاروں اور پیمانوں کو جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھتی اور ناپتی ہے، جدیدیت کہہ سکتے ہیں''۔[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدیدیت کو ایک اضافی چیز قرار دیا ہے۔ ''اضافی'' کے معنی و مفہوم ترقی، زیادتی، بڑھوتری، زائد وغیرہ کے ہیں، لفظ اضافی اضافیت سے مشتق ہے، جسکے معنی اضافی ہونا ہے۔ ایلبرٹ آئنسٹائن (Albert Einstein) کا نظریہ اضافیت بھی یہی نظریہ ہے آئنسٹائن نے اصول اضافیت کے جو نظرئے دئے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے۔

''۔۔۔۔۔ تمام مادے نہایت مختصر ذرات (particals) سے بنے ہیں۔ جنہیں جوہر کہا جاتا ہے اور یہ مستقل حرکت میں رہتے ہیں اور جس قدر تیزی سے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اتنی ہی زیادہ توانائی خارج کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ذرات

۱: نئی تنقید، مرتب (خاور جمیل)، ص ص ۷۹، ۸۰۔

میں بے حد توانائی موجود ہوتی ہے اور یہ مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کی یہ مسلسل حرکت، ان کی توانائی کو بھی حرکت دیتی ہے اور حرکت کی وجہ سے ذرات میں پوشیدہ توانائی خارج ہو جاتی ہے۔''[1]

مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ نظریہ، آئنسٹائن سے پہلے مرزا غالبؔ نے اپنی جدت طبع اور حکیمانہ سوچ کی مدد سے ایک فلسفیانہ انداز میں یوں پیش کیا تھا ؎

اب آرزوے شوق قیامت نہیں مجھ کو
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

دُنیا کے ہر ایک ذرے میں جو حشر برپا ہیں، وہ یہ کہ جوہر (Atom) چھوٹے ذروں کا بنا ہوا ہوتا ہے اور مستقل حرکت میں رہتا ہے۔ یعنی کبھی رُکتا نہیں ہے اور یہ مستقل حرکت ان ذروں کے اندر چھپی ہوئی توانائی کو خارج کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی حال زندگی کا بھی ہے، اس کو مستقل حرکت میں رہنا ہے، جس وقت حرکت میں کمی ہوگی ترقی میں بھی کمی آئے گی حرکت میں اضافہ ہوگا ترقی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح آئنسٹائن کا ایک اور مخصوص نظریہ اضافت یہ ہے۔

''اس اصول کے مطابق روشنی کی ایک کرن ایک بار اپنا سفر شروع کردے تو پھر وہ نہیں رکتی، یہاں تک کہ کوئی ٹھوس چیز اسکی راہ میں حائل ہو کر، اسے منتشر نہ کردے''۔[2]

اس اصول پر غور کیجئے روشنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی کسی ٹھوس چیز سے ٹکرانے کے باوجود رُکتی نہیں ہے، بلکہ اپنا رُخ تبدیل کرتی ہے۔ اسی طرح روشنی کو اگر منشور (Prism) یا شیشے کے تکون سے گزاریں، تو یہ روشنی کی کرن قوس قزح کے سات رنگوں میں منتشر ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تمام رنگ مل جاتے ہیں اور روشنی کا پیلا پن سفید شکل لے لیتا ہے، مگر اپنا سفر اور رفتار نہیں روکتا۔

۱۔ عبید الرحمٰن، البرٹ آئن اسٹائن، دو صدیوں کا نقاش، ماہنامہ اُردو دُنیا، نئی دہلی، جلد ۷، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۵ء، ص ۲۹۔

۲۔ ایضاً۔

آئنسٹائن کے اصولِ اضافت کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کائنات پر ہر وقت غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ایک معمولی ذرہ جس کی حقیقت ہمارے نزدیک کچھ بھی نہیں، حرکت کی وجہ سے توانائی خارج کرتا ہے اور روشنی کی ایک کرن حرکت کی ہی وجہ سے چلتی رہتی ہے، کبھی رکنے کا نام نہیں لیتی اور اگر ہم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے اس نظرئے پر غور کریں کہ ''جدیدیت ایک اضافی چیز ہے'' اور اسے جتنی حرکت دی جائے، اُسے اُتنی ہی توانائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جدیدیت روشنی کے کرن کی طرح ہے، جو مسلسل روشنی دیتی رہے گی۔

جس طرح ذروں کو جوڑ توڑ کر کے بذریعہ انضمام (Fusion) توانائی حاصل کی جاتی ہے، اُسی طرح جوڑ توڑ کر کے، جدیدیت ماضی اور حال کے علوم کو اپنے معیاروں کے حساب سے انہیں نئے معنی دے دیتی ہے اور وقت کے مطابق چلنا سکھاتی ہے۔ جدیدیت دراصل ایک مسلسل عمل ہے اور یہ دن اور رات کی طرح بدلتی رہتی ہے، آج کی جدیدیت کل قدیم ہو جائے گی۔ یعنی آج کی جدیدیت آنے والے کل میں گزرے ہوئے کل کی روایت بن جائے گی، مگر جو جدیدیت آج ہمارے پاس موجود ہے، اس میں گزرے کل کی روایت ہے۔ اسی طرح جو جدیدیت آنے والے کل میں روایت بن جائے گی، مگر یہی روایت گزرے ہوئے کل میں جاتے جاتے آنے والے کل کے لئے ایک اور جدیدیت کی راہ کو ہموار کرے گی، اسی طرح ہر جدید کے ساتھ قدیم شامل رہے گا، کیونکہ گزرے ہوئے کل کا حاصل ہمیں آنے والے کل کا محاصل یا نتیجہ فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لئے ہمیں گزرے ہوئے کل کو فراموش نہیں کرنا ہے یہ اس روشنی کی کرن کی طرح ہے، جو کسی ٹھوس چیز سے ٹکرا کر منتشر تو ہو جاتی ہے، مگر ختم نہیں ہوتی، اسے ہم ایک مثال کے ذریعے سے، اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم دن کے دوران سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اسی دوران چاند بھی سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اور پھر یہی روشنی جو اس نے دن کے دوران سورج سے حاصل کی تھی رات کے

دوران منعکس ہوکر رات میں کام آجاتی ہے، یہی حال روایت کا ہے۔ روایت پچھلے دن یا گزرے ہوئے دن کی وہ روشنی ہے، جو دوران شب پھر کام آجاتی ہے، یعنی روایت کے بغیر جدیدیت اُس تاریک رات کی طرح ہے، جو وحشت اور خوف کے سوا کچھ نہیں اور روایت کے ساتھ جدیدیت اس چاندنی رات کی مانند ہے جو اپنے حسن و جمال سے تاریک رات کو روشن کرتی ہے اور آنے والے دن میں تاریک رات کی وحشت اور خوف ساتھ نہیں لاتی، بلکہ حسین رات کا تصور اور ایک اطمینان جس سے آنے والا کل پُر کیف اور حسین نظر آتا ہے۔ اس مثال کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر جدت میں روایت شامل رہتا ہے۔ یعنی ہر جدید میں قدیم شامل رہتا ہے اور ہر قدیم سے جدید بنتا رہتا ہے یہ ایک مستقل عمل ہے۔ جو کبھی بھی رُکنے کا نام نہیں لیتا، یعنی اس میں ماضی، حال اور مستقبل، تینوں زمانے شامل ہے۔ فطرت، فلکیات (Astronomy)، علم طبیعات (Physics) یا انسانی عقل کے نظریہ سے دیکھیں تو ہر نظریہ یہی کہتا ہے کہ چلنا ہی زندگی ہے اور رکنا جمود کے سوا کچھ نہیں! جو رک گیا اُس پر زمانے کی گرد پڑ جائے گی اور وہ اس کے نیچے دب کر رہ جائے گا اور جو چلتا رہے گا وہ زندگی، کائنات اور قدرت کے کرشموں کو نئے رنگوں میں دیکھتا رہے گا اور اس کا نظریہ نئے نئے رنگوں کو دیکھ کر، نکھرتا اور تبدیل ہوتا جائے گا۔ جدیدیت کا نظریہ بھی یہی ہے کہ پُرانے رنگوں کو نئے رنگوں میں ملا کر ایک اور نئے رنگ میں رنگ جانا۔

علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے

ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پُرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

علی سردار جعفری کے فلسفہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ''جو مصروف سفر رہتا ہے، ماضی کی صراحی مستقبل کے پیمانوں میں'' اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے اس قول کی کہ ''جدیدیت ایک اضافی چیز ہے۔۔۔ اس طرح اس کی کوئی ایسی ممکن تعریف نہیں ہوسکتی، جو دس سال بعد بھی صحیح یا دُرست ثابت ہو''۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، یہ ایک مستقل عمل ہے، کیونکہ آج کی جدیدیت کو ایک سال، دو سال یا دس سال بعد جدیدت نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ اُس وقت ایک روایت ہوگی اور جدیدیت کیا ہوگی اس کا پتہ نہیں!

ضیا فاطمہ اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''قدیم اور جدید کے درمیان خط امتیاز کھینچنا دشوار ترین مرحلہ ہے، اس کے ایک ہی رُخ کو کبھی جدید اور کبھی قدیم کہہ دیا جاتا ہے، یہ بحث ادب وفن کے تعلق سے افلاطون اور ارسطو کے دور سے جاری ہے۔ مختلف ادوار میں جب کسی دانشور، مفکر، ادیب، شاعر یا فن کار نے روایت کی تقلید سے انحراف کیا، تو اُس سے ''جدیدیہ'' کہہ کر مطعون کیا گیا۔ ادبیات کی تاریخ میں، یہی رویہ ادبی سطح پر متنازعہ بنا رہا۔

اس دور کے فن کاروں نے اپنی روش سے انحراف کرنے والے کو ''جدیدیہ'' کہا۔ اردو ادب کی تاریخ میں بھی یہ عمل بار بار دہرایا گیا ہے۔ خواہ آزاد، حالی، سرسید، نذیر احمد کا دور ہو خواہ ترقی پسندوں کا ہو یا عصر حاضر سے متعلق ہو''۔[1]

ضیا فاطمہ کے مطابق جدید اور قدیم کے درمیان دیوار کھڑی کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہے۔ کیونکہ ہر جدید میں قدیم شامل ہے اور جو آج جدید ہے، وہی کل قدیم ہوگا اور کل ایک اور جدید ہمارے سامنے موجود ہوگا، مگر اس میں بھی، یہ جدید، جو کل قدیم ہوگا، شامل رہے گا۔ ان معنوں میں جدیدیت ایک غیر منقطع یا مسلسل عمل ہے۔ جو کبھی رُکنے کا نام نہیں لے سکتا اور ہر وقت نئی تبدیلیوں کے ساتھ اور نئی وضع اور رنگ ڈھنگ کے ساتھ ہمارے سامنے موجود رہے گا اور ہم اسے ''جدیدیت'' کے نام سے پکاریں گے۔

ضیا فاطمہ نے اس نظریئے کو سمجھانے کے لئے اپنے مضمون ''جدیدیت کے معانی و مفاہیم'' میں، احتشام حسین کے مضمون ''جدید غزل چند اشارے'' کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''جدید کسی آج کے ذہن ناقد یا فن کار کی دریافت نہیں ہے، کیونکہ ہر قدیم کا جدید ہوتا رہا ہے اور ہر عہد کا فن کار اس سے اپنے شعور کے مطابق سمجھا تا رہا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اسے نقطہ آغاز بھی سمجھتے رہتے ہیں اور حد آخر بھی، ایسے لوگوں کا شعور تاریخی نہیں، تخیلی اور رومانی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ جو لوگ جدیدیت کو ایک مسلک اور عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ان کیلئے جدیدیت ایک مطلق، قائم بالذات، شخصی اور باطنی کیفیت ہے۔ لیکن جو لوگ جدیدیت کو ایک

۱: جدید اُردو غزل، ص ۱۳۔

تاریخی التزام کی حیثیت سے ارتقاء کی ایک منزل قرار دیتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ تبدیلی کے وسیع عمل کا ایک جزو ہے، جو کسی اور تبدیلی کے لئے فضا کو ہموار کر رہا ہے۔ کسی گزری ہوئی تبدیلی کا نتیجہ اور کسی آنے والی تبدیلی کا سبب''۔[1]

احتشام حسین بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جدیدیت ایک مسلسل عمل ہے، جو کبھی رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ جدیدیت کو مسلک کے بجائے خصوصیت کی بنیادوں پر دیکھنا چاہئے۔ روایت شکن ہونا ضروری ہے اور نہ روایت پرست، بلکہ روایت شناس ہونا چاہئے، علم اور عقل کی مدد سے روایت سے اچھائیں اور افادیت نکال کر انہیں نئے انداز میں منظّم کرنا چاہئے۔ روایت کو رد کر کے نئی کوئی ایجاد کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ ایڈسن نے برسوں برقی بلب کے اندرونی تار (Filament)، جو روشنی دیتا ہے، پر محنت کر کے ہی برقی بلب ایجاد کیا۔ یہ نئی ایجاد تبھی ممکن ہو سکی، جب ایڈسن نے اُن تاروں کو رد نہیں کیا جن پر اُس نے برسوں تک محنت کی، بلکہ اُن ہی تاروں کو جوڑ توڑ کر برقی بلب کا اندرونی تار بنایا۔ اسی طرح جدیدیت کے لئے بھی روایت سے استفادہ کئے بغیر رہنا ممکن نہیں۔

گویا کہ ''جدیدیت'' ایک ایسے سکے کی مانند ہے، جس کے دو رُخ ہیں ایک رخ قدیم اور دوسرا رخ جدید۔ اگر اس سکے کا ایک رخ ختم کر دیا جائے، تو اس کی افادیت ختم ہو جائے گی اور اس کی قدر و قیمت نہ ہونے کے برابر رہے گی۔ اس کے بجائے اگر اس سکے کے دونوں رخ صحیح سلامت ہونگے، تو اسکی قدر و قیمت اور افادیت روز بہ روز بڑتی جائے گی اور اگر ہم اس سکے کو اُچھالیں، اچھالنے کے بعد جب یہ زمین پر گرے گا، جو رخ ہمیں نظر آجائے گا، وہ جدیدیت ہے اور جو حصہ نظر نہ آئے، وہ اس حصے (یعنی نظر آنے والے حصے) کا پس منظر ہوگا اور اسی پس منظر سے نظر آنے والا حصہ پیدا ہوا ہے، جسے ہم جدیدیت کہتے ہیں۔ اسطرح ہم اس

۱: سہ ماہی، فنون، جدید غزل نمبر، ص ۲۳۔

نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر جدید کے پیدا ہونے میں قدیم کا اہم رول نمایاں ہے، اسکے بغیر اگر کہیں بھی کچھ جدید جنم لیتا ہے، تو وہ بے ذائقہ اور خشک ہے۔ بلکہ اسکو جدیدیت نہیں کچھ اور کہنا چاہئے۔

اس معاملے کو سبط حسن نے بہترین انداز میں اس طرح سمجھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''بہار کا موسم نئی زندگی کا پیغام لاتا ہے، ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ پُرانی قومیں نئے سال کا آغاز ہمیشہ موسم بہار کی آمد سے کرتی تھیں۔ کیوں کہ بہار پر اُن کی معیشت، بلکہ بقا کا انحصار ہوتا تھا۔ وہ بہار کا خیر مقدم گیتوں، رقص اور تہواروں سے کیا کرتی تھیں۔ اسی لئے موسم کے حد تک یہ بتانا کہ جدید دور کب شروع ہوا اور قدیم دور کب ختم ہوا، بہت آسان ہے۔ مگر ادب کی دنیا میں قدیم اور جدید کے درمیان خط امتیاز قائم کرنا اتنا آسان نہیں۔ کیونکہ ادب ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے''۔[1]

سبط حسن کی اس فکر آموز اور فلسفیانہ بحث کے آینے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں، جدیدیت ایک مسلسل عمل ہے، ایک ایسا مسلسل عمل ہے، جسکا ایک پس منظر ہے اور جو کل کسی اور تغیر یا تبدیلی کا پس منظر ہوگا۔ جو کل سے بنا ہے اور جس سے کل بنے گا، جدیدیت کو اور بہتر سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل نسخہ (Formulla) میرے خیال میں بہتر رہے گا، اس کی مدد سے جدیدیت کو سمجھنا بے حد آسان ہوگا۔

کل، آج اور کل

اس نسخے کی مدد سے ہم جدیدیت کو بے حد آسانی کے ساتھ سمجھ سکے گے۔ کل کے معنی ماضی کے ہیں جو گزر گیا یا گزرا کل اور جسکی بدولت آج ہمارے پاس کچھ ہے۔ آج کے معنی حال

۱: افکار، کراچی، منتخب مضامین نمبر، مرتب: ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ص ۹۵۔

کے ہیں، اس وقت یا موجودہ وقت یا ''اب'' جو کل یعنی گزرے کل سے بنا ہے۔ یعنی گزری ہوئی تبدیلی کا نتیجہ اور دوسرے کل کے معنی مستقبل کے ہیں، جو بننے والا ہے یا جو آج سے بنے گا۔ یعنی آنے والے تبدیلی۔ اسی نسخے کو دوسرے انداز میں اسطرح بھی لکھ سکتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ماضی ——— حال ——— مستقبل

(Future _____ Present _____ past)

کل ——— آج ——— کل

(Past____ Present_____Future)

اس وقت یعنی حال میں ہمارے پاس کیا ہے؟ جدیدت ہے، وہ ہمیں کہاں سے ملی؟ ماضی میں کی گئی محنت سے، اور ماضی میں کی گئی یہ محنت اگر مثبت ہے، تو یہ حال میں ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے، اگر مثبت اور افادی نہیں ہوگی، تو یہ بے مقصد ہے۔ اس کا حال میں کوئی کام نہیں اور ہمیں حال میں کچھ آفادی کام کرنا ہے، کیوں کہ یہی حال، کل یعنی مستقبل میں ہمارا ماضی ہوگا اور کل کا مستقبل تبھی اس کو قبول کرے گا، جب یہ صحت مند ہوگی۔ جیسے آج ہم نے تبھی روایت کو قبول کیا، جب وہ حال سے چلنے کے لائق تھی اور اسی طرح جو آج ہمارا مستقبل ہے، کل ہمارا حال ہوگا اور ہم اسی کو جدید کہیں گے اور یہی نسخہ ہمیشہ قائم رہے گا، کیونکہ سورج غروب بھی ہوگا، تو طلوع بھی ہوگا۔ دن اور رات بنتے رہیں گے۔ تبدیلیاں ہوتی رہیں گی اور یہ سلسلہ روز قیامت تک جاری رہے گا اور اسی سلسلے کو ہم مسلسل عمل یا جدیدیت کہہ سکتے ہیں۔ کل، آج اور کل والے اس سلسلے میں خورشید اکبر صاحب کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا:

> ''اردو ادب میں ایک ذہین، حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے، جو تحقیق، تنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے۔ یہ نئی کھیپ ماضی کی

صحت مند اقدار کی بازیافت، حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کی طرف مصروف ریاضت ہے''۔[1]

خورشید اکبر صاحب ایک ایسی نسل کے آنے کی خبر پیشین گوئی کی صورت میں دے رہے ہیں، جو حساس اور باشعور ہوں، جن کا ہر ایک کام تحقیق، تنقید اور تخلیق پر مبنی ہو، جو ہر کام تعمیری کریں، جن سے ادب کو بھی فائدہ ہو اور لوگ بھی مستفید ہو جائیں۔

مگر ان کے پاس ایسا کیا ہوگا؟ یہ کون ہونگے؟ جو تحقیق، تنقید اور تخلیق سے کام لیں گے! یعنی جن میں تحقیق، تنقید اور تخلیق تینوں چیزیں ایک ساتھ موجود اور محفوظ رہیں گیں۔ اسکے لئے موصوف نے تین شرائط کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ کیونکہ موجودہ نسل تجرباتی اور عملی ذہن رکھتی ہے اور موجودہ ذہن ہر بات کی جانچ کرنے کا عادی بن گیا ہے اور ہونا بھی چاہئے، کیونکہ اسے ہماری تخلیقات نکھر جاتی ہیں۔ موصوف نے ہماری تخلیقات کو نکھارنے اور بہتر بنانے کے لئے جو تین شرائط لگائی ہیں، وہ اس طرح سے ہیں:۔

۱۔ ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافت

۲۔ حال کا ہمہ جہت عرفان

۳۔ مستقبل کی روشن سمت

۱۔ ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافت:

ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافت سے پہلے ہمیں، ماضی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کے لغوی معنی گزرے ہوئے زمانے کے ہیں۔[2] خواہ وہ ماضی بعید ہو یا ماضی قریب، گزرا

۱: مخدوم محی الدین، حیات اور شاعری، ص ۷۔

۲۔ جامع فیروز اللغات، اُردو، ص ۱۱۸۴۔

ہوا کل ماضی کہلائے گا، اس گزرے ہوئے کل میں جو کچھ کیا گیا خواہ وہ ہمارے ذریعے ہو یا ہمارے اسلاف کے ذریعے سے، اسے ہم روایت کا نام دیں گے یعنی ماضی میں کئے گئے کام ہمارے لئے روایت ہے اور روایت کی تفسیر یا معنی چند لفظوں میں ممکن نہیں اسکا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے، روایت کے لغوی معنی ہیں کسی بات کی نقل کرنا[1] اور نقل کرنے کے معنی وہ جاندار چیزیں، جو حال ماضی سے، نئی نسل اسلاف سے، جانشین پیش رو سے اور اولاد اپنے والدین سے نقل کرتے ہیں روایت کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے جو جاندار اور صحت مند چیزیں ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ جاتے ہیں یا ہمارے سُپرد کرتے ہیں یا جن کی ہم نقل کرتے ہیں وہی روایت ہے اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ روایت، ثقافت، تہذیب یا کلچر کے مترادف ہے۔ کیونکہ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (۳) سماجی علوم میں اس ضمن میں لکھا گیا ہے:

> ''۔۔۔۔۔۔ کلچر کی اصطلاح انسانیاتی (Anthropological) تناظر میں مخصوص معنوں میں کی جاتی ہے۔ اس خاص مفہوم میں کلچر سے مُراد انسان کا سماجی ورثہ ہوتا ہے۔ انسانی گروہ دو اعتبار سے باہم مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے ایک جسمانی ساخت اور ہیت ہے اور دوسرا سماجی یا عمرانی ورثہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ کلچر نہ صرف ورثے میں پایا جاتا ہے بلکہ انسان اپنے ارضی مسکن پر زندگی کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے اپنے ماحول میں تبدیلیاں بھی لاتا ہے اور کلچر کے اندر ردو بدل کا باعث بھی بنتا ہے''۔[2]

مندرجہ بالا بیان کے تناظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلچر یا ثقافت ورثے میں حاصل ہوتی ہے اور روایت بھی ورثے میں ہی حاصل ہوتی ہے اس طرح دونوں اصطلاحیں لازم وملزوم ہیں

۱: جامع فیروز اللغات، اُردو، ص ۱۱۸۴۔

۲۔ جامع اُردو انسائیکلو پیڈیا، جلد ۳، (سماجی علوم)، ص ۴۸۷۔

بلکہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ کیونکہ دونوں اصطلاحیں ورثے میں حاصل ہوتی ہیں۔ وراثت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بلاعوض اور بغیر مشقت کسی چیز کا مالک ہو جائے۔ مگر یہاں روایت کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز، جو مشقت سے حاصل ہو جائے، کیونکہ یہاں جائیداد مال یا جاگیر مُراد نہیں، بلکہ علم وفن مُراد ہے۔ اس لئے یہاں بغیر مشقت کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ اس بحث میں بغیر اُلجھے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روایت مشقت اور محنت سے حاصل ہونے والی ماضی کی وہ جاندار اور صحت مند اقدار ہیں، جو حال اور مستقبل میں بھی ہمارے کام آسکتی ہیں انسائکلو پیڈیا (مذہب اور علم واخلاق) ۔۱۲، میں اس سلسلے میں لکھا گیا ہے:

"The word tradtion means etymologically handingover; the conception of tradition therefore implies.

a) a deposit which is handed over and

b) depositaries i.e to say persons who are in possession of the deposit and are commissional to preserve it and transmit it to sucessors"[1]

روایت ماضی کی ایک جاندار اور صحت مند صورت ہے اور اس کو پانے کے لئے کافی محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ بغیر محنت اور مشقت اس کو پانا ممکن نہیں، اسکے باوجود کہ یہ ورثے میں ملی ہے، اسے پانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان تاریخی شعور رکھتا ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقم طراز ہیں:۔

''نئی نسل کو ایک بار پھر یہ بتادو کہ کوئی شاعر، کوئی فن کار، تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اسکی اہمیت تو اس میں مضمر ہے کہ مرحوم شعرا اور فن کاروں سے اسکا کیا رشتہ ہے؟ اصل فن کار وہ ہے، جس کا تاریخی شعور زندہ ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے۔ اسی طرح حال ماضی کو بدلتا رہتا ہے''۔[۲]

---

1. Encyclopedia of Religions and Ethics. vol.12, edited by James Hestings, p.41.

۲۔ نئی تنقید، مرتب: خاور جمیل، ص ۸۳۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی طرح، ٹی۔ایس ایلیٹ بھی یہی کہتے ہیں کہ روایت کے لئے تاریخی شعور ہونا چاہئے۔ کیوں کہ آپ خود بخود کچھ نہیں کر سکتے، جب تک نہ آپ کے پاس کوئی پختہ روایت موجود ہو۔ روایت ایک ایسی تثلیث ہے، جس میں بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل موجود ہوتے ہیں۔

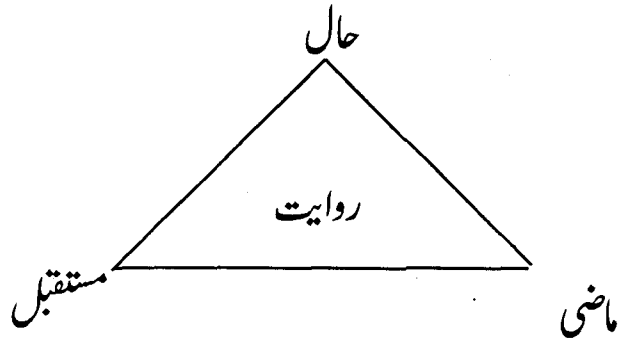

اگر ہمارے پاس روایت موجود نہیں ہوگی، تو ماضی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخی شعور کے بغیر ماضی کی کوئی اہمیت نہیں۔ روایت کو پائے بغیر حال زندہ نہیں رہ سکتا اور مستقبل کے خاکے نہیں کھینچے جا سکتے۔ اس لئے ہر فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے بتائے ہوئے اصولوں اور طور طریقوں سے ایک رشتہ قائم کرے۔ کیونکہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے ماضی سے علحیدہ ہو کر اہمیت نہیں رکھتا۔ ہر فن کار کو پیش رو فنکاروں کے درمیان رکھ ہی پرکھا جا سکتا ہے، ہر ادیب بحیثیت ایک فن کار اور ایک انسان کے اپنے زمانے سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالت سے کبھی بھی لاتعلق نہیں رہتا، بلکہ اپنے طور سے اسکی مکمل طور عکس بندی کرتا رہتا ہے گویا کہ ایک فن کار اپنے حال اور ماضی دونوں سے واقفیت رکھتا ہے، یعنی اپنے پیش رووں کے تجربوں اور اصولوں سے سبق حاصل کرتا ہے کہ وہ کس طرح کامیاب اور ناکام رہے، ان ہی تجربوں اور اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے حال کی تعمیر نو کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے مستقبل اور آنے والی نسل کے لئے ایک اور روایت کی تشکیل کرتا ہے۔ اس طرح روایت ایک

ایسی تثلیث کے اِردگرد گھومتی ہے۔ جس میں بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کے خطوط نظر آتے ہیں۔

روایت جس تثلیث کے اردگرد گھومتی ہے، اس میں ماضی، حال اور مستقبل کی آمیزش، تسلسل اور ربط پیدا ہوتا ہے، اس آمیزش اور تسلسل کو ہم اقبالؔ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اقبال کا تاریخی شعور زندہ تھا۔ انہوں نے اپنے پیش رو شعراء سے اپنا رشتہ دریافت کرلیا تھا۔ وہ خود کو رومیؔ کا مرشد بتاتے ہیں، رومیؔ کے علاوہ وہ حافظؔ اور غالبؔ سے بھی متاثر تھے۔ انہوں نے ماضی سے حال کا رشتہ متعین کر کے، پھر خود غور وفکر کر کے، حال سے ماضی کو بدل دیا۔ اسلام کے قدیم تصور میں تاریخی شعور کے ساتھ روایت کا دامن تھامے، جدیدیت کے وہ تمام عناصر شامل کر دئے، جو آفاقی بھی ہیں، ہماری روایت سے وابستہ بھی اور عہد حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق بھی ہیں، یہ جدیدیت کے مثبت معنی کی مثال ہے، جس میں تینوں چیزیں ایک تثلیث کی صورت میں موجود ہیں۔ جن میں ربط اور تسلسل برابر قائم ہے اور ادب میں اس ربط وتسلسل کا ہونا ضروری ہے۔ کسی بھی ادیب یا فن کار کو کامیاب ہونے کے لئے اس تسلسل اور ربط سے شعوری لگاؤ پیدا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی ادیب یا فن کار اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کرے، تو اُس کے حال میں فرق یہ ہوگا کہ اُس کا حال شعوری نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ شعوری حال ایک طرح سے ماضی کی آگاہی کا نام ہے۔ وہ آگہی جسے ماضی کا شعور بذات خود ظاہر نہیں کر پاتا۔ مرزا غالبؔ جن کے دیوان کو ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب بتایا گیا ہے اور جسکی نسبت بتایا جاتا ہے کہ وہ جدید طبیعت کے مالک تھے اور جنکی اپنی ایک الگ لفظیات اور اسلوب بیان ہے۔ انہوں نے کوئی علاوہ لفظیات ایجاد نہیں کی، بلکہ روایتی علامتوں اور استعاروں کو ہی نئی معنویت دے دی، اور اسی نئی معنونیت نے انہیں حیات جاوید بخشی۔ اگر اسکے بجائے غالبؔ جدید پرستی کے قائل ہوتے یا صرف روایت پرست بن جاتے، تو شاید آج وہ غالبؔ نہ ہوتے۔ ہمیں روایت پرست بننا ہے اور نہ ہی روایت شکن، بلکہ ہمیں روایت کی مدد سے اپنی زندگی میں نئی

معنویت اور ایک نیا رنگ بھر دینا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ماضی سے رشتہ منقطع کرنے کو پاگل پن سے تعبیر کرتے ہیں:

''ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لینا پاگل پن ہے۔ جیسے فرد کے دماغی صحت کا راز اس کی یادوں میں مضمر ہے۔ اسی طرح جماعت کی دماغی صحت کا راز روایت کے تسلسل میں مضمر ہے تسلسل کسی کلچر کو توانائی کا راز سکھاتا ہے''۔[1]

لیکن مندجہ بالا اقتباس کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مندرجہ ذیل اقتباس کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے:۔

''۔۔۔۔۔۔۔۔روایت اگر یہی ہے کہ ہم اپنے پیش روؤں کی کامیابیوں کی صورت ہی کو برقرار رکھیں، تو پھر ایسی روایت سے انحراف لازمی ہے۔ اس قسم کی روایت پرستی جلد ہی اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ ہر جدت بازگشت سے بہتر ہے''۔[2]

ڈاکٹر جمیل جالبی اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مذکورہ بالا اقتباسات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، ہمیں اپنے ماضی سے رشتہ منقطع ہی کر لینا ہے اور نہ ہی روایت کے سمندر میں اس قدر ڈوب جانا ہے کہ باہر نکلنا دشوار ہو جائے۔ بلکہ ہمیں روایت سے مستفید ہو کر اپنے حال اور مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانا ہے۔ صحیح سمت کی طرف جانے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہم روایت کا گوشت کھائیں اور ہڈیاں کتوں کیلئے چھوڑ دیں!

روایت اپنے زمانے کا ایک جاندار اور صحت مند تجربہ ہوتا ہے۔ جس کی روشنی میں رہ کر ہزاروں، لاکھوں اور ایسے تجربے جنم لیتے ہیں، جو آنے والی نئی نسل کے لئے ایک اور روایت بن جاتے ہیں۔ اس لئے نئے تجربے کرتے وقت روایت سے سبق حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

۱: نئی تنقید، مرتب: خاور جمیل، ص ۳۰۷۔

۲۔ مترجم صدیق کلیم، جدید تنقید کا منظر نامہ (اساس۔ استنباط)، مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص ۶۵۔

بعض لوگ روایت کا عرفان حاصل کرنے کے بغیر ہی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے نئے تجربات کرتے وقت بعض لوگ ایک الگ ہی زبان تخلیق کرتے ہیں۔ جس کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ مگر ماضی سے رشتہ منقطع کر کے کسی زبان کو خلق کرنا ممکن نہیں، ایسا کرنے والے ناکاموں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور زمانہ انہیں سننے کے لئے تیار نہیں ہو جاتا۔ روایت ہر ادب کی جان ہوتی ہیں، اسے اکتساب فیض کرنا ہر ادب کی شعوری ذمہ داری ہوتی ہے۔ روایت ادب کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ روایت کی ادب میں وہی اہمیت ہے، جو عمارت میں بنیاد کی اہمیت ہوتی ہے۔ عمارت کی بنیاد جتنی مضبوط ہوگی، پوری عمارت اُسی قدر مستحکم ہوگی۔ بنیاد جتنی کمزور ہوگی عمارت بھی اُتنی ہی کمزور ہوگی۔ اسی طرح ادب میں جس قدر روایت سے استفادہ کیا جائے گا اور اُن روایات کو نئے معنوں میں ڈھالا جائے گا، ادب اُتنا ہی مضبوط اور شریں ہوگا اور اگر روایت کے بجائے خالی جدت سے کام لیا گیا، تو ادب بے مزہ بن کے رہ جائے گا۔ روایت ادب کی وہ حقیقت ہے، جس سے اسکی پہچان ممکن ہوسکتی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہر ادب میں اپنی جاندار روایات نہیں ہوتی ہیں، جن سے ہر وقت استفادہ ممکن ہو، اس صورت میں ادیب یا فنکار کو دوسرے ادبیات کی روایات سے مستفید ہونا چاہئے۔ مثال کے طور پر انگریزی ادب میں اپنی جاندار روایت موجود نہیں تھیں، جن کی بناء پر اس ادب کو بڑی حد تک فنا ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنے ذہن کو بیدار کر کے اور اپنے ادب کو جاندار بنانے کے لئے اور زندہ رکھنے کے لئے لاطینی اور یونانی ادب سے اکتساب فیض کیا اور اپنے ادب کو زندگی بخشی۔

مختصر یہ کہ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی روایات سے اکتساب فیض کریں اور اپنے ادب کو جاندار بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ تا کہ آنے والی نسل ہم سے اکتساب فیض کرے، مگر وہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے، جب ہم روایت کی بازیافت کر کے اور اس پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی چھان

بین کر کے، یعنی روایات کو نتھارنے کے بعد ہی اسکو موجودہ ادب میں شامل کریں اور اپنے ادب کو تعمیری بنائیں۔ یہی ماضی کی صحت مند اقدار کی صحیح بازیافت کا نام ہے۔

۲۔ حال کا ہمہ جہت عرفان:

حال کے لغوی معنی ہیں، ''موجودہ زمانہ'' اس وقت، جو زمانہ موجود ہے۔ یعنی جس زمانے سے ہم گزر رہے ہیں یا جس میں ہم رہ رہے ہیں، حال کہلاتا ہے۔ یعنی وہ زمانہ جو ہمارے آج سے منسوب ہے۔ حال کو ہم، عصر حاضر کے نام سے بھی پہچان سکتے ہیں اور عصر حاضر کو ہم ''عصریت'' کے نام سے بھی سمجھ سکتے ہیں یا جان سکتے ہیں، گویا لفظ حال، عصریت کے مترادف ہے۔ جس کا تعلق موجودہ زمانے کے ساتھ ہے، پروفیسر مشیر الحق مرحوم اس کو یوں سمجھاتے ہیں:

> ''ماڈرن کے مفہوم کو ہم اردو میں عام طور سے ''جدید'' کے لفظ سے ادا کرتے ہیں اور اسی کی پیروی میں ''ماڈرنزم'' تجدد پسندی اور ''ماڈرنسٹ'' تجدد پسند بن جاتا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں ایک مخصوص ذہنی اور فکری کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے پہلے سے ہی استعمال کی جارہی ہیں۔ ۔۔۔۔۔۔۔ اسی طرح جدیدیت بھی اب کوئی معصوم لفظ نہ رہ کر، اُردو ادب کی ایک خاص فکری تحریک کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی لئے میں نے خواہ مخواہ کی الجھن سے بچنے کی خاطر، ماڈرنٹی کے لئے ایک دوسرا عربی الاصل لفظ ''عصریت'' استعمال کیا ہے، جس کا رشتہ زمانہ سے جڑا ہوا ہے''۔[1]

جس کا رشتہ زمانہ سے جڑا ہوا ہے، کے معنی ہیں، موجود زمانہ سے یا آج سے، جو زمانہ قائم ہے، جس کو ہم حال کہتے ہیں۔ اس حال میں رہنے کے لئے، ایک انسان کو مبازرت طلبی یا

۱: جدیدیت اور اقبال، مرتب، پروفیسر آل احمد سرور، ص ۴۷۔

چیلنجز (Challenges) کا سامنا ہوتا ہے۔ اُس کے دل میں زندگی بہتر ڈھنگ سے جینے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس لئے اُس کے دماغ میں مقابلہ کا جذبہ جاگ اُٹھتا ہے۔ جو اُسے دوسروں سے بہتر زندگی گزارنے کی کوشش کرنے کے لئے تحریک دیتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک انسان ہمیشہ ایسی کوشش اور کشمکش میں رہتا ہے کہ میں سب سے الگ اور آگے رہوں، یہ کوشش ہر اعتبار سے ہوتی ہے، چاہے جسمانی ہو یا ذہنی، سماجی ہو یا اقتصادی، تعمیری ہو یا تہذیبی، عملی ہو یا ادبی، ہر اعتبار سے انسان سب سے الگ بنے رہنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہاں بات ادب کی ہو رہی ہے، ادبی اور علمی لحاظ سے بھی ایک ادیب، محقق، نقاد اپنی الگ پہچان بنانے کی کوشش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اس کیلئے وہ مختلف النوع تجربات، انکشافات اور ایجادات کرتا رہتا ہے۔ کوئی اپنی تحریروں کو اسلوبیاتی اعتبار سے، تو کوئی ساختیاتی اعتبار سے اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں مصروف عمل رہتا ہے اور اپنے ادب کو تعمیری اور افادی بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، وہ ماضی کا مطالعہ کر کے اُس میں سے بہتر چیزیں ڈھونڈ نکالنے میں مصروف عمل رہتا ہے۔ تاکہ اپنے حال کو بہتر سے بہتر بنائے، غرض ایک ادیب، ایک محقق اور ایک نقاد کو حال کا ہمہ جہت عرفان ہونا چاہئے۔ تب جا کے وہ ایک بہتر مستقبل کی سوچ سکتا ہے۔

۳۔ مستقبل کی روشن سمت:

وہی شخص آگے بڑھ سکتا ہے، جسے مستقبل کی بہتر فکر لاحق ہو۔ اگر کوئی شخص یا قوم فقط اپنے حال میں ہی مست ہو کر بے فکر بیٹھی رہے اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچے، اُس کا مستقبل ایک خوف ناک تاریک شب کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مستقبل کے لغوی معنی، آیندہ، آگے آنے والا، وہ فعل جو آنے والے زمانے سے تعلق رکھتا ہو، ان معنون میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل کے معنی آنے والے زمانے کے ہیں، جس زمانے میں قدم رکھنا ہے۔ اور جس زمانے کے بنانے میں 'حال' کا عمل دخل بھی ہے اور ماضی کا بھی، اس طرح یہ کہا جا

سکتا ہے، کہ جو زمانہ دو زمانوں سے مل کر تیار ہو جائے، وہ زمانہ ان دو زمانوں (ماضی اور حال) سے زیادہ معتبر ہو گا۔ اس طرح زمانہ مستقبل، زمانہ حال اور ماضی سے زیادہ وسعت اور جامعیت اپنے اندر رکھے ہوئے ہے۔ اسی وسعت اور جامعیت کے پیش نظر مستقبل میں قدم رکھنا دو زمانوں سے گزر کے حاصل جمع حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، یعنی جس نے جو کچھ زمانہ ماضی میں اور حال میں حاصل کیا ہے، اُس کا محاصل زمانہ مستقبل ہے تقریباً اسی وجہ کو پس منظر میں رکھتے ہوئے خورشید اکبر صاحب نے ''مستقبل کی روشن سمت'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے جب مستقبل میں قدم رکھنا ہو، اس وقت ہمیں ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافیت کی بھی ضرورت پڑے گی اور حال کے ہمہ جہت عرفان کے بھی، یہ دونوں زمانے مستقبل کے روشن سمت کی طرف لے جائینگے۔

مندرجہ بالا بحث کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''جدیدیت'' کی تعمیر میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے برابر کے شریک ہیں۔ کوئی کم تو کوئی زیادہ، جدیدیت کا دار مدار تینوں زمانوں پر ہے یہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو کبھی نہیں رُکتا۔ اس مسلسل عمل کو مختصر انداز میں ڈاکٹر وحید اختر نے یوں سمجھایا ہے:

> ''جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اس سے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ ہر عہد میں جدیدیت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے اس لحاظ سے جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے''۔[1]

۱: جدیدیت اور ادب، ص ۳۹۔